نشانِ حیدر

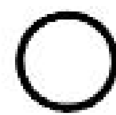
عاصم محمود



بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

جو خدا کی راہ میں جان قربان کر دیں انہیں مردہ ہرگز نہ کہو،
بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔



”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔
میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں کہ، خدا کی راہ میں مارا جاؤں،
پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر
مارا جاؤں۔“

(محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

نشانِ حیدر

ملی تاریخ کے دس فرزندوں کی داستان جنہوں
نے اپنا آج ہماری کل کے لیے قربان کر دیا

عاصم محمود

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.5 . Aasim Mehmood
Nishan-e-Haider/ Aasim Mehmood.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2006.
160pp.
1. Sawanch. I. Title.

2006
نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1299-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

تاریخ کا ایک نقش یہ ہے:

اُندلس مسلمانوں سے چھین لیا گیا، اور سوائے قرطبہ کی مسجد کے وہاں اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

تاریخ کا دوسرا نقش یہ ہے:

اسلام کے نام لیواؤں پر مسلم بنگال کی سرزمین تنگ ہو گئی، اور ایک سازش کے ذریعے اسے اپنے جسد سے الگ کر دیا گیا۔ اب وہاں مغربی پاکستان سے تعلق کا صرف ایک نشان باقی ہے ــــ اور وہ ہے ــــ لکشمی پور گاؤں میں ایک معرکہ کی یادگار،

لکشمی پور کی یادگار اس وقت کی یاد دلاتی ہے جب اسلامی اخوت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے، مغربی پاکستان کے ایک نوجوان نے مشرقی پاکستان کے دفاع میں اپنی جان عزیز کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

"نشانِ حیدر" کے یہ صفحات اس جری نوجوان کی نذر ہیں۔

جسے تاریخ ــــ "میجر طفیل شہید" کے نام سے پکارتی ہے۔

ترتیب

نشان حیدر —— تعارف

حق و باطل کی معرکہ آرائی پرانی بات ہے، ہر دور میں تاریکی نے روشنی اور جھوٹ نے سچ پر شبخون مارنے کی کوشش کی ہے، ہر دور میں جب تاریکی چھٹی اور سورج نے اپنی شعاعیں پھیلائیں تو روشنی میں حق و صداقت کی راہ پر چلنے والے چند ایسے تابناک چہرے اجاگر ہوئے جو اس روشنی کے خالق تھے، جنہوں نے اپنی جان تج کر، اپنا آپ قربان کر کے باطل کو ہزیمت سے دوچار کیا اور سچ کا بول بالا کیا —— ایسے لوگوں کے عظیم کارناموں یا ایثار و محبت کا مول تو نہیں چکایا جا سکتا، لیکن عقیدت کے اظہار اور ان کے کارناموں کے اعتراف میں انہیں انعام و اعزاز کا استحقاق ضرور دیا جا سکتا ہے۔ یہ انعامات روپے پیسے کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اور عزت و وقار کے کسی خطاب کی صورت میں بھی، جسے ”اعزاز“ کہتے ہیں یہ اعزاز بسا اوقات انعام یافتہ کے نام کا جزو بن جاتا ہے جس طرح حضرت علیؓ کو مختلف غزوات میں جرأت و بہادری کے بے مثال کارناموں پر ”شیر خدا“ اور ”اسد اللہ الغالب“ جیسے خطابات سے نوازا گیا اسی طرح اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایسے افراد کو جنہوں نے اس مملکت کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دیا اسے کسی نہ کسی صورت میں انعام والقابات سے نوازا جاتا ہے۔

”نشان حیدر“ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے جس کے بعد بالترتیب ہلال جرأت، ستارۂ جرأت اور تمغۂ جرأت کا نمبر آتا ہے۔ شیر خدا حضرت علی المرتضٰی حیدر کرار کے نام کی نسبت سے اس کا نام ”نشان حیدر“ رکھا گیا ہے۔ یہ اعزاز مسلح افواج کے ان جوانوں کو دیا جاتا ہے جو انتہائی پرخطر حالات میں بہادری کا بہت بڑا کارنامہ یا

غیر معمولی جرأت دکھاتے ہیں اور زمین پر، سمندر میں یا فضا میں دشمن سے نبردآزما ہوتے ہوئے ایثار و قربانی، فرض شناسی و جوانمردی، جرأت و قیادت اور حب الوطنی دلی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ صرف وہ اپنے ملک و قوم کا نام روشن کرتے ہیں بلکہ اپنی جان کا نذرانہ دیتے ہوئے تاریخ کے صفحات میں حیات دوام پاتے ہیں۔

"نشان حیدر" پانچ کونوں والا ایک ستارہ ہے جو توپ کی دھات یا تانبے اور رانگ کی آمیزش سے بنایا جاتا ہے۔ ان کونوں کے کنارے سفید ایمل کی ہوئی تانبے اور نکل کی مرکب دھات کے ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے ڈیڑھ انچ کی چوڑائی کا ریشمی اور سبز ربن ہوتا ہے۔ جب یہ ربن تمغے کے بغیر پہنا جاتا ہے تو ربن کے اوپر اس پنج کونی ستارے کی ایک مختصر سی شبیہ لگائی جاتی ہے۔ نشان حیدر کی اوپر والی پٹی پر نمایاں حروف میں "نشان حیدر" کندہ ہوتا ہے۔ اس اعزاز کی پشت پر نشان حیدر حاصل کرنے والے خوش نصیب جوان کی مختصر تاریخ درج ہوتی ہے، جس میں شہید کا نام، آرمی نمبر، جائے شہادت اور ولادت و شہادت کی تاریخ درج ہوتی ہے۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والا اپنے نام کے ساتھ "این-ایچ" لکھ سکتا ہے۔

"نشان حیدر" فوج کے کسی بھی رینک کے جوان کو اس کے غیر معمولی کارنامے پر دیا جاسکتا ہے۔ جو ملک و قوم کی طرف سے عقیدت و احترام کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ یہ اعزاز برطانیہ کے سب سے بڑی فوجی اعزاز "وکٹوریہ کراس" کے برابر ہے۔ اس اعزاز کے حاصل کرنے والوں کے ورثا کو ماہانہ الاؤنس اور دس ہزار روپے نقد یا تین مربعے اراضی دی جاتی ہے۔ پاکستان میں اب تک یہ اعزاز دس خوش نصیب جوانوں کو دیا جا چکا ہے جو اپنے لہو کی حدت سے وطن عزیز کو سرخرو کر گئے۔

پہلا نشان حیدر کیپٹن راجہ محمد سرور کو دیا گیا اور سب سے آخری نشان حیدر حوالدار لالک جان شہید کو۔ اب تک جن جوانوں نے نشانِ حیدر حاصل کیا ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

پہلا نشانِ حیدر کیپٹن راجہ سرور کو ملا، وہ 27 جولائی 1948ء کو کشمیر کے محاذ پر شہید ہوئے۔

دوسرا نشانِ حیدر میجر چودھری طفیل محمد کو دیا گیا، 7 اگست 1958ء کو لکشمی پور

(مشرقی پاکستان) کے محاذ پر شہید ہوئے۔

تیسرا نشانِ حیدر میجر راجہ عزیز بھٹی کو ملا جنہوں نے 12 ستمبر 1965ء کو لاہور کے محاذ پر شہادت پائی۔

چوتھا نشانِ حیدر پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید کو دیا گیا جنہوں نے 20 اگست 1971ء کو ٹھٹھ کے قریب پاکستان کے اغوا کیے جانے والے طیارے کو گرا کر غدار انسٹرکٹر مطیع الرحمٰن کو جہنم واصل کیا اور خود شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پانچواں نشانِ حیدر میجر محمد اکرم شہید نے حاصل کیا۔ انہوں نے 13 دسمبر 1971ء کو ہلی (مشرقی پاکستان) کے محاذ پر شہادت پائی۔

چھٹا نشانِ حیدر میجر شبیر شریف کا تھا جنہوں نے 6 ستمبر 1971ء کو گورمکھیڑہ کے محاذ پر شہادت پائی۔

ساتواں نشانِ حیدر سوار محمد حسین کا تھا جنہوں نے 10 دسمبر 1971ء کو ہرڑ خورد کے معرکہ میں اپنے فرائض کی حدود پھلانگ کر دشمن کو شکست سے دوچار کیا اور بالآخر شہید ہوگئے۔

آٹھواں نشانِ حیدر لانس نائیک محمد محفوظ کو ملا، جنہوں نے 1971ء کی جنگ میں "پل کنجری والا" معرکہ کے دوران جام شہادت نوش کیا تھا۔

نواں نشانِ حیدر کیپٹن کرنل شیر خان نے حاصل کیا۔

دسواں نشانِ حیدر حوالدار لالک جان نے حاصل کیا۔ وہ کارگل کے محاذ پر شہید ہوئے۔

پہلا نشان حیدر

سرور شہید

یہ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام کا ذکر ہے۔ ایک نوجوان کمبل اوڑھے چلا جا رہا ہے، ایک خستہ حال بوڑھا تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور سردی کی شکایت کرتے ہوئے اللہ کے نام پر امداد چاہتا ہے۔ نوجوان ایک نظر میں بوڑھے آدمی کو دیکھتا ہے۔ آنکھوں کے کونے بھیگنے لگتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کے یہ آنسو بہہ نکلیں وہ جلدی سے اپنا کمبل اتارتا ہے اور بوڑھے کو دے دیتا ہے۔ بوڑھا آدمی جسے اس غیر معمولی سلوک کی توقع نہ تھی اس فیاضی کو مذاق سمجھتا ہے اور عجز و انکساری سے کمبل لوٹانے لگتا ہے۔ لیکن اس نوجوان کی پیار میں ڈوبی ہوئی آواز اور محبت بھرا اصرار اسے یقین دلا دیتا ہے اور وہ کمبل اوڑھے دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ چھا جاتی ہے اور وہ شاداں و فرحاں گھر کی طرف چل دیتا ہے۔

دوسروں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا یہ نوجوان جس نے سردی کی پرواہ کیے بغیر اپنا کمبل ایک ضرورت مند کو دے دیا تھا۔ کیپٹن راجہ محمد سرور خان شہید تھا۔ وہی کیپٹن سرور جو ساری عمر لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتا رہا، یہاں تک کہ جب وطن کو ضرورت پڑی تو اس نے اپنی جان بھی قربان کر دی اور نشان حیدر کا اعزاز پایا۔

خاندان

کیپٹن سرور شہید کا تعلق ایک معزز راجپوت بھٹی گھرانے سے تھا۔ ان کے



کیپٹن راجہ محمد سرور شہید نشانِ حیدر

والد کا نام راجہ محمد حیات خاں تھا جو فوج میں حوالدار کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ بہت خدا ترس، فیاض اور نیک دل انسان تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں اپنی شاندار کارکردگی کی بنا پر انگریز حکومت سے انہیں ضلع لائل پور کے چک نمبر 229 گ ب تحصیل سمندری میں تین مربع زمین انعام میں ملی۔ کافی دیر تک وہ اسی گاؤں کے نمبردار رہے۔ بحیثیت ایک نمبردار کے ان کا کردار ہمیشہ مثالی رہا۔ وہ پکے مسلمان تھے اور اسلامی احکامات کی سختی سے پابندی کرواتے تھے۔ گاؤں والوں کے کئی معاملات ان کے حسن تدبیر سے طے پائے۔ انتہائی منصف مزاج تھے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا انتقال 23 فروری 1932ء کو ہوا۔ اولاد میں چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ راجہ محمد مرزا خاں سب سے بڑے صاحبزادے تھے جو ہوبہو اپنے باپ کی تصویر تھے اور باپ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور جب ریٹائر ہوئے تو دفعدار میجر تھے۔ وہ بہت نڈر، بہادر اور فرض شناس تھے۔ حکومت وقت سے بہت سی تعریفی اسناد کے علاوہ ایک مربع زمین بھی انعام میں پائی۔

حیات محمد خاں کے دوسرے صاحبزادے محمد سردار خاں تھے یہ بھی فوج میں حوالدار کے عہدے پر مامور تھے۔ تیسرے صاحبزادے کا نام راجہ محمد افسر خاں تھا۔ انہوں نے فوجی ملازمت تو اختیار نہ کی البتہ ساری عمر زمینداری کرتے رہے۔ بہت شریف، ہنس مکھ اور نیک دل انسان تھے اور اپنے انہی اوصاف کی وجہ سے علاقہ کی یونین کونسل کے ممبر بنے اور بے حد مقبول ہوئے۔ کیپٹن سرور شہید چوتھے صاحبزادے تھے۔

ابتدائی حالات

کیپٹن راجہ محمد سرور شہید 10 نومبر 1910ء کو موضع سنگوری تحصیل گوجر خاں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ سنگوری پنجاب کا وہ حصہ ہے جہاں کے لوگ تاریخی طور پر سخت جان، جفاکش اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت نے اسے "مارشل ایریا" کا نام دیا تھا جس میں راولپنڈی، جہلم، کیمبل پور، میانوالی اور سرگودھا کا پہاڑی علاقہ شامل ہوتا ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر بنجر اور غیر آباد سا

ہے۔ کیوں کہ بارشوں کی کمی کی وجہ سے زرخیزی بہت کم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے زیادہ تر لوگوں کو فوج میں ملازم ہو کر پیٹ پالنا پڑتا ہے۔ سرور جس روز پیدا ہوئے وہ عید کا دن تھا اور پورے عالم اسلام میں خوشیاں منائی جارہی تھیں اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس روز آپ کی شہادت ہوئی وہ بھی عید سے اگلا دن تھا۔ آپ کی پیدائش پر بہت خوشی منائی گئی۔ چونکہ یہ گھرانا بے حد مذہبی تھا اس لیے انہوں نے ابتدائی تعلیم مسجد ہی میں حاصل کی۔ جب ان کی عمر چھ برس کی ہوئی تو آپ کے والد انہیں اپنے ہمراہ چک نمبر 229 گ ب ضلع لائل پور لے گئے جہاں آپ نے مقامی سکول میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ سرور شہید بچپن ہی سے بے حد محنتی اور بلا کے ذہین تھے۔ ہر جماعت میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کرتے۔ 1925ء میں تاندلیانوالہ ضلع لائل پور مڈل سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں لائل پور آگئے اور اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوگئے۔ 1927ء میں سترہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔

ان کی طالب علمانہ زندگی انتہائی سادہ اور معصوم تھی۔ بڑے ذمہ دار اور فرض شناس تھے۔ شروع ہی میں مذہبی رجحانات کی طرف مائل تھے۔ بڑے صلح کن اور امن پسند تھے۔ طبیعت میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی آپ کے ہمجولیوں کو آپ سے شکایت پیدا نہ ہوئی۔ ان دنوں اگرچہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے جہالت کا دور دورہ تھا اور پارٹی بازی عام تھی لیکن وہ ہمیشہ دنگے فساد سے دور رہے۔ جس زمانے میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں تعلیم اتنی عام نہ تھی۔ مسلمان سیاسی ابتری کا شکار تھے اور حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد مسلمانوں میں سے صرف کلرک پیدا کرنا تھا۔ مگر سرور شہید کی یہ تمنا تھی کہ وہ ایک سپاہی بنیں اور ملک و ملت کا نام روشن کریں بالآخر اپنی لگن اور مستقل مزاجی سے وہ اپنے ان عزائم میں کامیاب ہوگئے۔

سرور شہید بڑے خوبصورت وجیہہ جوان تھے۔ قد درمیانہ، جسم سڈول اور اعضاء متناسب تھے۔ موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور بھاری مونچھیں چہرے پر بہت جچتی تھیں۔ آواز میں بلا کا رعب، دبدبہ اور تمکنت تھی۔ ان کا رنگ گندمی تھا چونکہ ان کا خاندان فوجی خاندان تھا اس لیے بچپن ہی سے سپاہیانہ خوبیوں کے مالک تھے۔

فوجی وردی کو بے حد پسند کرتے۔ اور فوجیوں کو ان کی وردی میں دیکھ کر بے حد خوش ہوتے۔ فوج میں ملازمت کے دوران فوجی وردی زیب تن کرتے لیکن جب گھر آتے تو دیہاتی لباس یعنی شلوار یا دھوتی اور قمیض پہنتے۔ سردیوں میں کالی شیروانی پہنتے اور سر پر ترکی ٹوپی رکھتے۔ جمعہ کے روز نماز کا خصوصی اہتمام کرتے، بادامی رنگ کا چوغہ پہن کر نماز ادا کرنے جاتے۔ مذہبی امور سے خاصی شناسائی تھی۔ کلام پاک کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل، سیرت و سوانح اور اخلاقیات کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔ فوجی جرنیلوں کے واقعات سے بہت رغبت تھی۔ اقبال کے مداح تھے اور ان کے بہت سے اشعار انہیں ازبر تھے۔ ٹریننگ کے دوران جب کلاس میں لیکچر دیتے تو ان کی پر کشش شخصیت اور بنے تلے الفاظ بچوں پر سحر طاری کر دیتے اور سبھی ان کا لیکچر بہت ذوق و شوق اور توجہ سے سنتے۔

سیرت و کردار

سرور شہید بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ علی الصبح اٹھتے، نہا دھو کر نماز پڑھتے اور کلام پاک کی تلاوت کرتے۔ عبادت سے فارغ ہو کر سیر کو جاتے۔ بعد ازاں ناشتہ کرتے اور اس کے بعد مطالعہ کرتے۔ اسی دوران بچوں کو پڑھانے اور ملاقاتیوں سے ملاقات کرتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر تک آرام کرتے۔ نماز ظہر کے وقت اٹھ جاتے۔ نماز ادا کرتے اور پھر مطالعہ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے۔ انہوں نے کبھی اکیلے چائے نہیں پی تھی۔ کسی نہ کسی شخص کو ضرور دعوت دیتے۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاتے اور عشاء کی نماز کے بعد دیر تک گھر والوں سے باتیں کرتے رہتے۔

سرور شہید بے حد ملنسار، خلیق اور خوش مزاج انسان تھے۔ جو شخص بھی ان سے ملاقات کرتا ضرور متاثر ہوتا۔ وہ انسانوں میں کسی فرق اور تمیز کے قائل نہیں تھے۔ چھوٹے بڑے سب کو ایک سا سمجھتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو پریشان ہو جاتے۔ بہت زیادہ فیاض تھے ان کی سخاوت کے کئی واقعات علاقہ کے لوگوں میں اب تک مشہور ہیں۔

سرور بے حد نازک احساسات کے مالک تھے اور نیکی اور سچائی پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

ایک دفعہ سرور شہید مندرہ سے تانگہ میں سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بڑھیا ملی اس نے اللہ کے نام پر کچھ مانگا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس ٹوٹے پیسے نہیں تھے اس لیے انہوں نے بڑھیا سے معافی مانگ لی۔ لیکن جب تھوڑی دور گئے تو پیٹ میں درد سا محسوس کرنے لگے۔ اسی وقت تانگے کو موڑا اور بڑھیا کو تلاش کرنے لگے۔ بہت تلاش کے بعد شام کے وقت وہ بڑھیا ملی۔ اسے پیسے دیئے۔ معافی مانگی اور تانگے والے کو سارے دن کی اجرت عطا کی۔

حسن سلوک اور سخاوت کے بارے میں ان کا یہ واقعہ بہت سے افراد کو یاد ہے

> ایک روز شام کے وقت چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک خستہ حال بوڑھے پر نظر پڑی جو بڑے مضمحل انداز میں کنوئیں کے پاس بیٹھا تھا۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے اور چلنے سے معذور ہے۔ اس بوڑھے نے خواہش ظاہر کی کہ اسے مسجد تک پہنچا دیا جائے، لیکن سرور شہید اسے اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ آرام دہ بستر پر لٹایا اور گھر والوں کو پر تکلف کھانا تیار کرنے کو کہا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو آپ نے اس کے ساتھ مل کر کھایا اور بعد میں اپنے ہی بستر پر سلا دیا۔ گھر والوں نے اس بات کو ناگوار محسوس کیا اور کہا کہ بوڑھا غلیظ دکھائی دیتا ہے اور اس کی جوئیں بستر میں پڑ جائیں گی۔ سرور شہید یہ بات سن کر مسکرائے اور کہا کہ تو پھر یہ بستر بوڑھے کو ہی دے دیا جائے گا۔ اگلی صبح آپ نے اس بوڑھے کے ساتھ ناشتہ کیا جب وہ رخصت ہونے لگا تو سرور شہید نے اسے کچھ رقم پیش کی اور دور تک چھوڑنے گئے۔

کیپٹن سرور شہید انسانوں میں کسی درجہ بندی کے قائل نہ تھے۔ آدمیوں میں تفریق سے انہیں سخت نفرت تھی وہ اپنے اردلی کے ساتھ بھی ایک آفیسر کی بجائے ایک انسان کی طرح پیش آتے تھے، اس کی ہر ضرورت اور خواہش کا احترام کرتے۔

ان کے اردلی نے ایک موقع پر بتایا تھا کہ

ایک دفعہ کیپٹن صاحب نے مرغ کھانے کی فرمائش ظاہر کی۔ اس وقت وہ کیمپنگ ایریا میں تھے میں ان کے لیے مرغ پکا کر لایا تو کیپٹن صاحب نے سوال کیا کہ تم نے اپنے لیے بھی رکھا ہے کہ نہیں۔ میں نے صاحب کو کھانے کے لیے کہا اور بولا کہ میں بعد میں کھالوں گا۔ لیکن صاحب نے اسی وقت آدھا حصہ الگ کر دیا اور کہا کہ اسی وقت کھاؤ۔ میرے دانت میں درد تھا۔ اس لیے نہ کھا سکتا تھا۔ کیپٹن صاحب نے جب یہ دیکھا تو کہا کہ "یہ باہر جاکر کسی مستحق آدمی کو دے دو لیکن میرے سامنے سے اٹھالو۔"

کیپٹن صاحب کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا تھا۔ ہر دو تین ماہ کے بعد اپنے اردلی کو رخصت دے دیا کرتے تھے۔ اردلی، صاحب سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ اس کا چھٹی پر جانے کو دل ہی نہ چاہتا۔ کیپٹن صاحب اسے سختی سے گھر جانے کے لیے کہتے اور رخصت کرتے وقت کرایہ، کپڑے اور بہت سی چیزیں دیتے۔ جب اردلی چھٹی گزار کر واپس آتا تو اس سے گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کرتے۔

کیپٹن سرور شہید کی ساری زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

ان کی سخاوت وعبادت محض رضائے الٰہی کے لیے تھی۔ نمود و نمائش سے انہیں بہت نفرت تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کیمبل پور میں ایک مسجد زیر تعمیر تھی۔ کیپٹن صاحب کو جب علم ہوا تو انہوں نے اپنے اردلی کو پچاس روپے عطیہ دے کر بھیجا اور سختی سے منع کیا کہ ان کا نام نہ ظاہر کیا جائے۔ چنانچہ جب اردلی نے وہ پچاس روپے وہاں کے منتظم کو پیش کیے تو رسید کے لیے نام پوچھا۔ اردلی نے کیپٹن صاحب کی نصیحت کے موجب اصل نام ظاہر نہ کیا اور کسی اور نام سے رسید کٹوائی۔

وہ بہت مہمان نواز اور بڑے بے تکلف دوست تھے۔ کھانے کے وقت ان کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی کہ کوئی مہمان آکر مل جائے۔ اور اس کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔ چنانچہ اس انتظار میں کھانا اصل وقت سے ہمیشہ کافی دیر کے بعد کھاتے۔ کبھی اکیلے کوئی چیز نہ کھاتے پیتے بلکہ دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے۔ اسی طرح جب کسی دوست کے ہاں جاتے تو اسے تکلف برتنے سے سختی سے منع کرتے جو کچھ پکا ہوتا اسے بڑی بے تکلفی سے کھاتے۔

جوانی اپنے ساتھ امنگوں اور جذبات کا ایک طوفان لے کر آتی ہے اور اس طوفان کے سامنے اکثر لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں لیکن کیپٹن سرور شہید نے اپنی نظر کو جگہ جگہ بھٹکنے سے بچایا اور عین عالم شباب میں بھی پاک و پاکیزہ زندگی بسر کی۔

ایک بار ان کی رجمنٹ کے اعلیٰ افسروں نے محفل رقص و سرور کا بندوبست کیا۔ اتفاق سے اس محفل کا سارا بندوبست کیپٹن صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ کیپٹن صاحب نے بہت بچنے کی کوشش کی لیکن آفیسر کا حکم تھا اس لیے مجبور ہوگئے اور سارا انتظام خود کیا لیکن رقص کے شروع ہوتے ہی کیپٹن صاحب محفل سے باہر چلے گئے۔ کمانڈنگ آفیسر کو بہت حیرت ہوئی اور جب اس نے اس بارے میں پوچھا تو کیپٹن صاحب نے جواب دیا کہ "یہ وقت میری عبادت کا تھا۔"

فوج میں ترقی کے لیے کمانڈنگ آفیسر کی خفیہ رپورٹ کو بہت دخل ہوتا ہے اگر یہ رپورٹ کسی کے حق میں بہتر ہو تو اُسے ترقی دے دی جاتی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ رپورٹ بُری ہو تو یہ ترقی روک لی جاتی ہے۔ چونکہ کپتان صاحب ایماندار اور پکے مسلمان تھے اس لیے وہ نشہ آور چیزوں سے سخت نفرت کرتے اور لہو و لعب کی محفلوں میں شریک نہ ہوتے۔ ان کے ایک دوست نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کے ایک افسر نے ان کی خفیہ رپورٹ میں ان کے بارے میں یہ فقرہ لکھ دیا۔

" He is un-social, He does not mix with the officers"

اس رپورٹ کے بارے میں جب کپتان صاحب کو پتہ چلا تو مسکراتے ہوئے بولے۔ "اگر Social ہونے سے مراد تقریبات میں شامل ہو کر شراب وغیرہ پینا اور بدفعل کرنا ہے تو میں Un-Social ہی بھلا ہوں۔"

ایک بار کپتان کے پانچ چھ دوستوں نے فلم پر چلنے کا اصرار کیا۔ کپتان صاحب نے بہت بچنے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ نہ ٹلے تو کپتان صاحب نے جیب سے پچاس پچاس روپے نکال کر دے دیئے کہ وہ لوگ جاکر پکچر دیکھ آئیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ ان کے جانے کے بعد کپتان صاحب اپنے اردلی سے بولے اور کہا کہ ان کے رزق میں ضرور کوئی آمیزش ہوگئی ہے جو یہ روپیہ غلط جگہ خرچ ہوا ہے۔ اگلے روز کپتان کے دوستوں نے وہ روپے واپس لوٹا دیئے۔ کپتان صاحب نے پھر اردلی سے کہا کہ بخدا

روپیہ جانے کا دکھ نہ تھا بلکہ دکھ اس بات کا تھا کہ یہ روپیہ جائز راستے میں کیوں خرچ نہ ہوا۔ اس کے بعد خود اپنے اردلی سے فلم پر چلنے کو کہا۔ اردلی یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ اور کپتان صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ اب کپتان صاحب کا رخ پکچر ہاؤس کی طرف تھا۔ راستے میں جو بھی بھکاری یا مستحق آدمی دکھائی دیتا اسے روپے بانٹتے گئے یہاں تک کہ ایک گھنٹے کے بعد جب گھر لوٹے تو سب روپے بانٹ چکے تھے۔ اردلی کی حیرت کو بھانپتے ہوئے بولے دیکھا یہ پکچریں کتنی سکون بخش ہیں۔ کپتان صاحب کے چہرے پر اس وقت مسرت کی سرخی اور اطمینان کی جھلک تھی۔

اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت منصفانہ اور ہمدردانہ تھا۔ رہائش گاہ پر اگر کوئی سلیوٹ کرتا تو اُسے منع کرتے، ان کا خیال تھا کہ سلیوٹ صرف یونیفارم کی حالت میں ہونا چاہیے۔ بہت انصاف پسند اور درگزر کرنے والے تھے۔ کوئی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا تو فوراً معاف کر دیتے اور بڑے دھیمے انداز میں سمجھاتے۔ فوجی قوانین کی سختی سے پابندی کرتے اور اصول پرستی کو ساری عمر اپنا اشعار بنائے رکھا۔

گھریلو زندگی

کیپٹن محمد سرور کی شادی اپنے ہی خاندان کی نیک دل اور نیک سیرت خاتون محترمہ کرم جان سے ان کے آبائی گاؤں سنگوری میں 15 مارچ 1936ء کو ہوئی۔ یہ تقریب اسلامی روایات کے عین مطابق بہت سادگی سے منائی گئی۔ کیپٹن سرور کی بیوی بہت سلیقہ شعار، خوش اخلاق اور ملنسار خاتون ہیں۔ نہایت سادہ منش اور پرہیزگار خاتون ہیں۔ پردہ کی سخت پابند ہیں۔ یہاں تک کہ جب 27 اکتوبر 1959ء کو سابق صدر محمد ایوب خاں مرحوم سے نشان حیدر وصول کیا تو برقع پہنا ہوا تھا۔ (بعض لوگ اسمبلی کی رکن بیگم ریحانہ سرور کو کیپٹن سرور شہید کی بیوہ سمجھتے ہیں یہ غلط ہے۔ دراصل ریحانہ سرور میجر سرور شہید برادر ایم انور بار ایٹ لا کی بیوہ ہیں جو 1965ء کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے)

کیپٹن سرور شہید کی گھریلو زندگی انتہائی کامیاب اور خوشگوار تھی۔ سرور شہید گھریلو مسائل میں خاصی دلچسپی لیتے اور اکثر اپنی بیگم کا ہاتھ بٹاتے۔ جب چھٹی پر

گھر آتے تو کھیتوں میں جاتے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر ہل جوتتے، چارہ کاٹتے اور جب ان کے بھائی انہیں منع کرتے اور کہتے کہ یہ ایک افسر کی شان نہیں تو کیپٹن سرور قہقہہ لگا کر ہنستے اور کہتے "میری خوشی اس میں ہے کہ میں آپ کے کام آؤں، آپ کی خدمت کروں اور افسر تو میں فوجیوں کے لیے ہوں۔" اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ چھٹی پر گھر آتے سارے گاؤں میں ایک دھوم سی مچ جاتی۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان سے ملاقات کے لیے آتے۔ اپنے مسائل بیان کرتے اور کیپٹن سرور مقدور بھر ان کی امداد کرتے۔ بعض اوقات گاؤں میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو کیپٹن صاحب دونوں پارٹیوں کو بلاتے۔ ٹھنڈے دل سے ان کی شکایات سنتے اور فیصلہ کرتے۔ گاؤں والے ان کے فیصلے کو ہنسی خوشی تسلیم کرتے اور ان کی منصف مزاجی سے گاؤں میں امن و آشتی کی فضا ہموار ہو جاتی۔ کبھی کبھار گاؤں کے جوانوں سے مل کر کبڈی اور فٹ بال بھی کھیلتے۔ فوج میں ملازمت کے دوران بھی فٹ بال سے دلچسپی قائم رہی۔ چنانچہ انیسویں بریلی کورس کے دوران کیپٹن صاحب کی فٹ بال ٹیم نے جولائی 1943ء کو "ایفی شیشی کپ" جیتا۔ فٹ بال کے علاوہ گھوڑ دوڑ اور نشانہ بازی کے بھی بہت شوقین تھے۔ چھٹیوں میں اکثر شکار کھیلا کرتے تھے۔

ملازمت

راجہ محمد سرور شہید کا گھرانہ فوجی گھرانہ تھا۔ خاندان کے کئی افراد فوج میں ملازمت کر رہے تھے۔ چنانچہ بچپن ہی سے انہیں بھی فوج میں شمولیت کا شوق تھا۔ حالانکہ ان کے بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں گارڈ کی حیثیت سے کام کرتے لیکن کیپٹن صاحب کا شوق جنون کی حد تک تھا اور یہی شوق انہیں فوج میں لے آیا۔ ان کی فوج میں آمد بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔

یہ 1929ء کا ذکر ہے بہار کا موسم تھا اور راولپنڈی میں شاہ بری لطیف کا عرس شروع تھا۔ کیپٹن اس عرس میں شرکت کے لیے گئے۔ انہی دنوں پنڈی میں فوج کی بھرتی جاری تھی۔ چنانچہ وہ مزار پر حاضری دینے کے بعد سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہو گئے اور ایک سپاہی کی حیثیت سے بلوچ رجمنٹ میں بھرتی ہو گئے۔ سب سے پہلا فوجی کورس

اولڈ بلوچ سنٹر کراچی میں کیا اور 31-1930ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کی مہم میں خدمات انجام دیں۔ یہ بلوچ رجمنٹ کی سیکنڈ بٹالین تھی جو آج کل ساتویں کہلاتی ہے۔ کیپٹن سرور شہید اس رجمنٹ میں 1941ء تک سپاہی اور حوالدار کے عہدوں پر فائز رہ کر اپنا فرض منصبی ادا کرتے رہے۔ اس وقت ان کا شمار ''نان کمیشنڈ افسروں'' میں ہوتا تھا۔ جنہوں نے ڈرائیونگ اور نظم و نسق کا کورس مکمل کیا تھا 1941ء میں انہیں رائل انڈین آرمی میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔ ان کی ذہانت اور اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر رائل انڈین سروس کور کے وی۔سی۔او سکول میں بطور انسٹرکٹر متعین کر دیا گیا۔ جہاں وہ بہت تھوڑے عرصے میں ترقی کرتے ہوئے صوبیدار کے عہدے پر پہنچ گئے۔ بحیثیت انسٹرکٹر ان کا کردار مثالی اور قابل تقلید تھا۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر سر انجام دیتے اور کلاس بڑی محنت اور جانفشانی سے پڑھاتے یہی وجہ تھی کہ ان کی کلاس ہمیشہ اول آتی اور اعلیٰ کارکردگی کا انعام حاصل کرتی۔

کیپٹن سرور 1942ء کو ہنگامی کمیشن کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ تربیتی کورس کی تکمیل کے بعد انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے کمیشن حاصل کیا اور 19 مارچ 1944ء کو سیکنڈ لیفٹیننٹ بنا دیئے گئے۔ اپنی محنت اور لگن کی بنا پر 27 اپریل 1944ء کو لیفٹیننٹ ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر 1945ء میں سرور شہید کو 1-مارز بٹالین میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں سے 15 مارچ 1946ء کو 3-پنجاب رجمنٹ میں منتقل کیے گئے۔ 3-پنجاب رجمنٹ میں اگست 1946ء تک مامور رہے۔ اس کے بعد انہیں چار ماہ تک فرسٹ پنجاب رجمنٹ میں رکھا گیا اور 30 دسمبر 1946ء کو سیکنڈ پنجاب رجمنٹ میں تعینات ہوئے۔ ان کی فرض شناسی اور اعلیٰ اقدامات کے صلے میں یکم فروری 1947ء کو انہیں فل کیپٹن بنا دیا جب ہمارا پاکستان معرض وجود میں آیا۔ سرور شہید اسی رجمنٹ سے منسلک تھے۔

معرکہ اُوڑی

انگریزی حکومت برصغیر پاک و ہند سے رخصت ہوتے ہوئے دونوں ممالک میں کشیدگی کی بنیاد ڈالنے کے لیے کشمیر کو وجہ نزاع بنا گئی۔ تنازعہ کشمیر کے باعزت

تصفیہ کے لیے حکومت پاکستان نے برابر کوششیں جاری رکھیں جن کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ دوسری طرف ہندو اپنی فطری عیارانہ پالیسیوں پر ڈٹا رہا۔ ایک طرف تو وہ امن و آشتی کا دعویدار بن کر دوستی کا نعرہ لگاتا رہا اور اندر ہی اندر کشمیر میں فوجوں کی کارروائیاں جاری رکھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہ تھی کیونکہ پاکستان جیسے ملک کو جسے معرض وجود میں آئے بہت ہی تھوڑا عرصہ ہوا تھا اور ابتدائی حالات بھی انتہائی ناگفتہ بہ تھے اس کے لیے ہندوستان جیسی طاقت کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ ہندو کا مقصد یہی تھا کہ وہ پاکستان کے وجود کو مٹا دے گا لیکن اس کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ خود پاکستان کی حکومت ہر جائز حربہ استعمال کر کے تنگ آ چکی تھی اور اب اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے، اگرچہ پاکستان جنگ کے قابل نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت فوج کے متعدد یونٹوں میں ردّ و بدل کی جا رہی تھی اور انہیں ترتیب دیا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں غیر منقسم انڈین آرمی ساز و سامان اور ہتھیاروں میں پاکستان کا جو حصہ تھا اس میں بھی ناانصافی کی گئی تھی اور جو کچھ پاکستان کے پاس موجود تھا وہ بھی انتہائی ناقص اور بے کار تھا۔ لیکن ان تمام کے باوجود پاکستانی جوانوں کا عزم صمیم ہر کمزوری پر غالب تھا اور صف شکن مجاہدوں نے اپنے جذبہ ایمانی اور شوق شہادت سے اس سرزمین کا وقار اور سلامتی قائم رکھی۔

جولائی 1948ء کا ذکر ہے کہ دشمن نے کشمیر میں ایک اہم مقام پر قبضہ کر کے اپنے مضبوط مورچے بنا لیے اور اب اس کا ارادہ پیش قدمی کا تھا۔ امن کے اس غارت گر کا منہ توڑنے کے لیے 2-پنجاب رجمنٹ کو کشمیر میں جانے کے احکام جاری کیے گئے۔ سرور شہید اس وقت جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں سگنل کورس کی ٹریننگ لے رہے تھے۔ اور آپ کی ٹریننگ ابھی ادھوری تھی۔ آپ کی رجمنٹ کے جوان جب کشمیر کے لیے رخصت ہوئے تو سرور شہید مچل اٹھے لیکن ٹریننگ کی تکمیل تک آپ کو وہیں رکھنا تھا چنانچہ جونہی ٹریننگ ختم ہوئی آپ نے یونٹ میں شمولیت کی درخواست دے دی جس کے جواب میں انہیں جی۔ایچ۔کیو ہی میں اپنے فرائض ادا کرنے کو کہا گیا۔ کیپٹن سرور شہید کا جذبہ شہادت انہیں ایک پل چین نہیں لینے دیتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

"سر میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے یونٹ میں شامل ہو کر کشمیری بھائیوں کو ظلم و ستم سے نجات دلاؤں۔ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کروں۔ مجھ سے یہاں نہیں رہا جاتا جب کہ میرے بھائی ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں سے جا چکے ہیں۔"

کمانڈنگ آفیسر نے جب یہ سنا تو بہت متاثر ہوئے۔ پھر وہ کیپٹن سرور شہید کی آنکھوں میں وہ چمک بھی دیکھ چکے تھے جو کسی غیر معمولی واقعہ کے رونما ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ چنانچہ انہیں فوراً محاذ پر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اجازت ملتے ہی ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا اور وہ عزیزوں سے ملنے کے لیے اپنے گاؤں سنگوری کو روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے اپنے استاد جن سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی ان کے پاس گئے اور محاذ پر جانے کی خوشخبری سناتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے لیے دعا کریں کہ اللہ انہیں شہادت کا مرتبہ نصیب کرے۔ اپنی غلطیوں کے لیے معافی مانگی اور دعائیں حاصل کیں۔ اس وقت کیپٹن شہید کے مکان کی تعمیر جاری تھی انہوں نے سب مزدوروں اور کاریگروں کو بلوایا اور ان کا حساب بیباک کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک ضروری کام کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر خدا کو منظور ہوا اور زندگی رہی تو باقی کام پھر مکمل کروا لوں گا۔"

کیپٹن سرور صرف دو دن کی چھٹی پر گاؤں آئے تھے۔ ان دنوں رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ اگلے روز آپ صبح حسب معمول نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر بچوں کے پاس گئے۔ جو گہری نیند سو رہے تھے۔ کیپٹن صاحب نے انہیں پیار کیا اور اپنی بیوی سے بولے:

"زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اگر اس نے چاہا تو میں کامیاب و کامران لوٹوں گا اور اگر اس نے شہادت کا رتبہ دیا تو یہ اس کی عنایت ہو گی میرے بعد تم ان بچوں کا خیال رکھنا۔ اس مکان کی تعمیر کروا لینا اور اسی میں بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنا۔"

اس کے بعد آپ گھر کے ایک ایک فرد سے ملے۔ گاؤں کے بے شمار لوگ آپ کے گھر میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہر ایک سے مسکراتے ہوئے ملتے۔ پھر وہ مندرا اسٹیشن پر آئے تو بھی گاؤں کے بے شمار لوگ انہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے آپ نے انہیں دعا مانگنے کو کہا کہ اللہ انہیں کامیاب کرے اور شہادت کا مرتبہ عطا کرے۔ یہاں سے رخصت ہو کر کیپٹن سرور شہید مری میں اپنی یونٹ سے جا ملے وہاں انہیں سگنل آفیسر کی حیثیت سے سکیلنگ کا کام سونپا گیا۔

شہادت

کشمیر جنت نظیر پر دشمن نے اپنی ناپاک سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ اڑی کے مقام پر ایک بلند پہاڑی پر دشمن کا قبضہ تھا جہاں سے وہ نہ صرف پاک فوج کی نقل و حرکت سے آگاہ رہتا تھا بلکہ مجاہدوں کی ہر کوشش رائیگاں جا رہی تھی۔ پاک فوج کے لیے یہ بات لازمی تھی کہ دشمن کو اس پہاڑی سے ہٹایا جائے۔ اس نازک صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے کمانڈر نے نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور کسی ایسے نوجوان کو اس کمپنی کی کمان سنبھالنے کی دعوت دی جو اس مہم کو سر کر سکتا ہو اور دشمن کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کمانڈر کی اس بات پر خاموشی سی چھا گئی وہ سمجھا کہ سبھی مایوس ہو چکے ہیں، اچانک ایک جوان آگے بڑھا جس کے فوجی سلیوٹ کی دھمک یقیناً دشمن نے بھی محسوس کی ہو گی۔ اس نوجوان نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کا عہد کیا۔ یہ نوجوان ہماری اس داستان کے ہیرو کیپٹن سرور شہید تھے۔ افسر بالا نے ایک نظر سرور شہید کو دیکھا اور ان کے عزم صمیم اور جذبہ جہاد سے متاثر ہو کر یہ ذمہ داری انہیں سونپ دی۔ اس ذمہ داری کے ملتے ہی کیپٹن سرور شہید کا جذبہ شہادت انگڑائیاں لینے لگا وہ بار بار بیتابانہ نظروں سے غنیم کی جانب دیکھتے اور اس وقت کا انتظار کرتے جب انہیں دشمن سے نبرد آزما ہو کر اسے کیفر کردار کو پہنچانا تھا۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جس کا کیپٹن سرور کو مدتوں سے انتظار تھا۔ یہ 27 جولائی 1947ء کا ذکر ہے۔ صبح کاذب نمودار ہوا چاہتی تھی۔ فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تقریباً ساڑھے تین کا وقت تھا اور پروگرام کے مطابق کیپٹن سرور شہید کی بٹالین نے

دشمن کو پسپا کرنا تھا۔ رات کی تاریکی، دشوار گزار راستہ اور اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن کا مقابلہ، عقل دنگ تھی لیکن

رع بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

حرب جواب دے گئے تو جذبے رہنما بن گئے اور شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن کا فلسفہ ایک بار پھر زندہ جاوید حقیقت بن گیا۔ کیپٹن سرور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایڈوانس کرنے لگا۔ مکار دشمن پہلے ہی سے پوری طرح ہوشیار تھا چنانچہ اس نے مجاہدوں پر مشین گنوں اور توپوں سے گولوں کی بارش شروع کر دی۔ حق و باطل کا یہ مقابلہ پورے جوبن پر تھا۔ مجاہدین ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بڑھ بڑھ کر دشمن کی خندقوں اور مورچوں پر بم برسا رہے تھے۔ اب دونوں طرف سے باقاعدہ فائرنگ شروع تھی۔ محاذ کی صورتحال انتہائی پیچیدہ تھی۔ دشمن ایک محفوظ پہاڑی پر ڈیرا ڈالے مجاہدین کے سروں پر اپنے مورچوں میں محفوظ بیٹھا تھا اور مجاہدین ایک خطرناک پہاڑی پر چڑھائی کر رہے تھے۔ کیپٹن سرور شہید عجیب جوش و دیوانگی میں دشمن پر بم برساتے ہوئے اپنی پلاٹون کی قیادت کر رہے تھے۔ آپ کا جوش و خروش اور مجاہدین کے ساتھ سینہ بہ سینہ لڑنا ساتھیوں کی ہمت افزائی کا موجب بن گیا تھا خود مجاہدین ایک ایسی چٹان بن گئے تھے جسے تسخیر کرنا دشمن کے بس میں نہ تھا۔

کیپٹن سرور جب ساتھیوں کی طرف دیکھتے تو ان کے جواں ارادے جسم و جاں کو نئی تقویت پہنچاتے اور کیپٹن صاحب "ساتھیو آگے بڑھو" کے نعرے لگانے لگتے۔

دشمن کی جوابی کارروائی جاری تھی کہ اچانک اللہ اکبر کی چیخ بلند ہوئی۔ فضا کو چیرتی ہوئی یہ آواز کیپٹن صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز پلاٹون کے برین گنر فرمان علی کی لگی تھی۔ وہ جام شہادت نوش کر گئے۔ کیپٹن سرور نے ان کی طرف دیکھا فرمان شہید کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی ایسی مسکراہٹ جو ان سے کہہ رہی ہو۔

"ہم محبت کی راہ میں کامیاب و کامران رہے اب تمہاری باری ہے۔"

اس دوران دشمن کا حملہ شدید ہو چکا تھا۔ کئی مجاہدین شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے تھے لیکن جوں جوں مجاہدین کی تعداد میں کمی آ رہی تھی ویسے ہی ان کا جوش و

جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کیپٹن سرور نے اپنے گنر کی گن کو خود سنبھالا اور جنونِ عشق میں دشمن پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ غنیم کے آدمی کیپٹن صاحب کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے اور خود سرور شہید گولیاں برساتے بہت آگے نکل گئے۔ اب دشمن کا مورچہ صرف 20 گز کے فاصلہ پر تھا۔ اس موقع پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ دشمن نے اپنے مورچوں کو خاردار تاروں سے محفوظ کر لیا تھا۔ تاروں کا یہ حصار ابھی بنا تھا کیونکہ کل رات اس حصار کے بننے کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ کیپٹن سرور شہید اس نازک اور غیر متوقع صورت حال سے بالکل ہراساں نہ ہوئے اور برابر دشمن پر فائرنگ کرتے رہے۔ دشمن نے جب ان کو ساتھیوں سے اکیلے اور تن تنہا لڑتے دیکھا تو سمجھ گیا کیونکہ ان کا انداز اپنے ساتھیوں سے جدا تھا اور ان کی گولیاں دشمن کو مسلسل زمین بوس کر رہی تھیں۔ دشمن نے اپنے گولہ بارود کا رخ کیپٹن سرور شہید کی طرف کر دیا۔ خود سرور شہید نے دشمنوں کی فوج میں ہلچل مچا دی تھی۔ عین اسی وقت ایک سنسناتی ہوئی گولی کیپٹن سرور شہید کے دائیں شانے میں لگی۔ جسم میں کھولتا ہوا خون راہ پاتے ہی تیزی سے بڑھنے لگا۔ وقت کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ اس خون کو بہنے دیا جائے۔ ویسے بھی زخم کی تکلیف سے زیادہ دشمن کو مٹانے کا خیال غالب تھا۔ کیپٹن سرور شہید مرہم پٹی سے بے نیاز خون میں لت پت پیش قدمی کرتے رہے۔

ساتھیوں نے جب آپ کو زخمی دیکھا تو پریشان ہونے لگے اچانک کیپٹن صاحب کی آواز گونجی "ساتھیو آگے بڑھو منزل قریب ہے" مجاہدین نے محسوس کیا یہ آواز پہلے سے زیادہ بلند، جوشیلی اور طاقتور ہے۔ اس آواز نے صور اسرافیل کا سا کام کیا جس کے ساتھ ہی کائنات میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ پاکستانی جوانوں کی فائرنگ نے دشمن کو ہراساں کر دیا تھا۔

کیپٹن سرور شہید بڑھتے بڑھتے خاردار باڑ کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ اسی دوران آپ کا ایک اور گنر اور چند ساتھی آپ کے ساتھ آ ملے تھے۔ کیپٹن سرور شہید کے جسم سے کافی خون نکل چکا تھا لیکن وہ تار کاٹنے میں مصروف تھے۔ اب دشمنوں کی ساری توجہ کیپٹن سرور کی جانب تھی۔ جو جان کی پرواہ کیے بغیر تاریں کاٹ کر ساتھیوں کے لیے راستے کی یہ آخری دشواری بھی دور کر دینا چاہتے تھے۔ اچانک دشمن کی ایک

گولی ان کی طرف آئی اور ان کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے نکل گئی۔ آپ کی دلی تمنا پوری ہو گئی ان کے چہرے پر ایسی خوشی تھی جیسے وہ جام شہادت سے مسرور ہوئے ہوں۔ مجاہدین نے جب اپنے کمانڈر کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس غصے میں انہوں نے دشمن پر ایسی کاری ضربیں لگائی کہ وہ مورچے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

صبح کا نور جب چاروں طرف پھیلا تو پہاڑی پر پاک فوج کا ہلال پرچم لہرا رہا تھا۔ چڑھتے سورج کی کرنیں کیپٹن سرور کے جسد خاکی کو غسل دے رہی تھیں۔ اوڑی کا محاذ مسلمان جیت چکے تھے۔ ظلم کی تاریکی چھٹ گئی تھی اور امن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ کشمیر کا ذرہ ذرہ شاداں و فرحاں اپنے حقداروں کو سلام کر رہا تھا اور سرزمین ''تل پترا'' کے مقام پر کیپٹن سرور شہید کو سپرد خاک کر دیا۔ یہ منگل کا دن تھا اور 27 جولائی 1948ء کی تاریخ تھی۔

اس فتح کی خبر جب پاکستانی عوام کو ملی تو ان میں خوشی و مسرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ کیپٹن سرور شہید کے کارناموں پر سر فرطِ عقیدت سے آپ ہی آپ جھکنے لگے۔ اس وقت کے صدر پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا نے کیپٹن سرور شہید کے اس عظیم الشان کارنامے کے اعتراف میں انہیں نشان حیدر سے نوازنے کا اعلان کیا یہ اعلان اسکندر مرزا نے 23 مارچ 1957ء کو یوم جمہوریہ پاکستان کے موقع پر کیا تھا لیکن یہ اعزاز 27 اکتوبر 1959ء کی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے انقلاب کی پہلی سالگرہ پر دیا۔ یہ تقریب راولپنڈی میں منعقد کی گئی جہاں کیپٹن سرور شہید کے کارناموں کا ذکر کیا گیا اور ان کی بیگم کرم جان کو کیپٹن سرور شہید کا نشانِ حیدر ملا۔ پاکستان میں یہ سب سے بڑا اور سب سے پہلا اعزاز تھا۔

تاثرات

شہید کی موت قوم کی حیات ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے خون سے وطن کی آبیاری کریں ملک و ملت کا قابل فخر سرمایہ ہوتے ہیں۔ کیپٹن سرور شہید کی شہادت باسعادت پر مختلف لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ سابق صدر فیلڈ مارشل

محمد ایوب خاں (مرحوم) نے ان الفاظ میں شہید کو خراج تحسین پیش کی۔

''ہماری بہادر افواج نے ہمیشہ سے بے مثال کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور کیپٹن سرور شہید نے اس روایت کے عین مطابق اپنے فرائض کی ادائیگی میں وطن عزیز کے لیے جان قربان کر کے قربانی کی عظیم مثال پیدا کی ہے۔ ہمیں چاہیے ہم شہید کی اس قربانی سے وطن کی محبت اور وطن کی خدمت کا درس سیکھیں۔''

سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ شہید کے بارے میں کہتے ہیں

''میں کیپٹن سرور شہید کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں جنھوں نے سب سے پہلے نشان حیدر حاصل کر کے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قربانی سے اپنا، اپنی فوج کا اور اپنی بٹالین کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ بے شک ان کی اس قربانی پر ہم سب کو فخر ہے، آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ اس سنہری کارنامہ کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔''

جنرل ٹکا خاں رقمطراز ہیں:

''پوری قوم سرور شہید کے شاندار کارنامے پر خراج تحسین پیش کرتی ہے، افواج پاکستان کی تاریخ میں ان کا کارنامہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔''

جنرل نیازی کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں:

''کیپٹن سرور شہید بہادر، نیک اور غیرت مند جوان تھے، وہ اپنے دوستوں میں بہت مقبول تھے۔ ایک اچھے افسر کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ ایک مثالی مسلمان اور مرد مومن تھے۔ بہت خوش اخلاق تھے اور اپنے وطن سے بے حد محبت کرتے تھے۔''

لیفٹیننٹ کرنل مسعود احمد جن کی قیادت میں پاک فوج نے اوڑی کا معرکہ سر کیا اور جو کیپٹن سرور کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ سرور شہید کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"سرور شہید ایک عام سا انسان تھا جس نے عام ماحول میں پرورش پائی۔ اس کا فوج میں جانا بھی ایک عام سا واقعہ ہے۔ اس نظام کائنات کی طرح اسے بھی ایک روز فنا ہونا تھا اور ہمیں بھولنا تھا لیکن حیات جاوداں اس کا مقدر تھی۔ اس کی یاد نے ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لیے نقش رہنا تھا۔ کشمیر میں جب حالات زیادہ سنگین ہوگئے تو وہ محاذ پر جانے کے لیے بیقرار ہوگیا۔ جذبہ جہاد اور شوق شہادت اس کے چہرے کی سرخی بن گیا تھا۔ اس نے موت کی ہنسی اڑائی۔ خون بہنے کے باوجود وہ دشمن کا صفایا کرتا رہا حتی کہ اس نے محاذ کا رنگ بدل دیا۔ نشان حیدر کا اعزاز تو اُسے بعد میں ملا۔ اس سے بڑا اعزاز اسے بہت پہلے مل گیا تھا—— "شہادت" کا اعزاز جس کی اسے تمنا تھی۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میرا نام اسی فوج کی فہرست میں شامل تھا جس میں سرور شہید کا نام تھا تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔"

میجر افضل خاں جو بہت عرصہ کیپٹن سرور شہید کے ساتھ رہے یوں لکھتے ہیں:

"میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے سرور شہید ابھی میرے قریب سے گئے ہیں اور مجھے نصیحت کر گئے ہیں کہ میں دشمن کی ناکامی اور ان کی شہادت کی دعا مانگوں مجھے وہ وقت یاد ہے جب وہ عزم و ہمت سے لیس دشمن کے لیے موت بن کر رخصت ہوئے تھے۔ یہ حسرت ہے کہ میں ان کے ساتھ شامل ہوتا لیکن یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ ہم دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ وہ میرے دوست تھے اور مجھے خوشی ہے کہ وہ مجھ سے بازی لے گئے ہیں۔ ان کی زندگی مثالی تھی میں نیند کا بہت شوقین تھا وہ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے لگتے تو مجھے بھی زبردستی اٹھاتے۔ میں انہیں مولوی کہتا تو وہ مجھے روکتے اور شہید کہہ کر پکارنے کو کہتے۔"

لیفٹیننٹ کرنل عباس خاں کیپٹن سرور کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔

کیپٹن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کیپٹن بہت بااخلاق تھے ہر ایک کی امداد کرتے۔ نماز کے بے حد پابند تھے بلکہ تہجد گزار تھے۔ اولیاء کرام کے بڑے عقیدت مند تھے اور ان کے مزاروں پر حاضری دیا کرتے تھے۔ ایک بار میں بھی ان کے ہمراہ نور پور شاہاں گیا بعد از سلام انہوں نے غربا میں کچھ رقم بانٹی اور بے حد مسرور ہوئے۔ بزرگان کے فیض کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ خدا کے یہ پیارے بندے مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور دوسروں کی روزی کا باعث بنتے ہیں۔ آج کئی لوگ ان کے طفیل اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ وہ شراب سے سخت متنفر تھے۔ حالانکہ انگریز آفیسرز شراب کو پارٹیوں کا ضروری حصہ سمجھتے تھے اور اکثر مسلمان افسر بھی انگریز کا ساتھ دیتے تھے لیکن کیپٹن سرور ایسی پارٹیوں میں ایک کونے میں کھڑے رہتے اور شراب کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔"

صوبیدار منگت خاں کا بیان ہے:

"سرور شہید فضول بات چیت نہ کرتے بہت کم گو تھے اور صرف کام کی بات کرتے تھے، ہمیشہ باوضو رہتے اور وقت کی قدر کرتے۔"



میجر چودھری طفیل محمد شہید نشانِ حیدر

دوسرا نشان حیدر

میجر طفیل محمد شہید

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

انسان کی پسند اس کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اسی طرح اچھے شعر کا انتخاب انسان کے فکر و عمل اور فہم و ادراک کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ شخص جسے اقبال کا یہ شعر اتنا پسند آیا کہ اس نے اپنی ڈائری کا آغاز اسی سے کیا اور جو صرف خداوند تعالیٰ کی مہربانیوں پر شاکر ہے۔ وہ شخص میجر طفیل محمد شہید تھا جس کی ساری زندگی سراپا عمل تھی جو نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی کا طالب تھا اور جسے صرف رضائے حق کی تمنا تھی۔ وہ عساکر پاکستان کے دوسرے جانباز تھے جنہوں نے اپنی جان قربان کر کے باطل کو ہزیمت سے دوچار کیا اور سچائی کا نور بکھرا دیا۔

خاندان

میجر طفیل محمد شہید کا تعلق ایک نسالی فوجی گھرانے سے تھا جس کے کئی افراد فوج سے وابستہ تھے اور جرأت و شجاعت کے کارنامے دکھا چکے تھے۔ بالخصوص ان میں سکواڈرن لیڈر محمد شریف، میجر محمد اختر، میجر نیاز علی اور فلائٹ سارجنٹ خورشید محمد قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے سبھی افراد اقبال کے اس شعر ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نفس کے تابع ہونے کی بجائے نفس کو اپنا مطیع و تابع بنالیا اور جن کی ساری زندگی ایک ایسا نمونہ ہے جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اپنے آبا کی یہی نسبت میجر طفیل محمد کی عساکرانہ زندگی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ان کے والد چوہدری موج الدین موضع کھرکاں ضلع ہوشیار پور کے رئیس تھے۔ اپنی فیاضی، رواداری، مہمانداری، ملنساری اور تدبر کی بنا پر عزت و تکریم کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ شب بیداری اور عبادت گزاری ان کا شیوہ تھی۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں صوفی کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کا دل خوف خدا اور عشقِ رسولؐ سے معمور تھا۔ ہر وقت دوسروں کی امداد پر کمربستہ رہنا، نیکی کے کام کرنے کے لیے اگر انہیں کوسوں دور جانا پڑتا تو وہ فوراً چل دیتے۔ گاؤں کے کئی یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بیمار اور مستحق لوگ ان کی زیرِ کفالت تھے۔ وہ بڑے پیر پرست تھے۔ پیر و مرشد کی بیعت کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام بھی مرشد کے مشورے سے رکھے۔ جہاں بھی اللہ کے نیک بندے اور بزرگ کے آنے کی اطلاع ملتی وہ اس کی زیارت کو فوراً چل دیتے۔ ان کے یہی اوصاف میجر طفیل شہید میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

میجر طفیل شہید کے والد چوہدری موج دین بسلسلہ ملازمت اپنے آبائی گاؤں موضع کھرکاں ضلع ہوشیارپور سے جالندھر کے گاؤں ساردبار میں چلے گئے جہاں 22 جولائی 1914ء کی ایک صبح میجر طفیل شہید کی ولادت ہوئی۔ جب میجر طفیل کی ولادت ہوئی تاریکی چھٹ رہی تھی اور سپیدہ سحر نمودار ہو رہی تھی۔ ایک صبح خنداں طلوع ہوئی جس کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ میجر طفیل کے سارے گھرانے میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ 1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو میجر طفیل شہید کا خاندان پاکستان آگیا اور ضلع ساہیوال کے چک 253 ای بی میں مقیم ہو گیا۔ یہیں اُن کے والد نے 7 دسمبر 1948ء کو رحلت فرمائی اور اسی سرزمین پاک پر سپردِ خاک ہوئے۔

ابتدائی زندگی

ایک اچھے انسان کی تکمیل میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ میجر طفیل کے والد اس حقیقت سے آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک سادہ سی تقریب کا اہتمام کیا

جس میں اپنے پیر و مرشد کو مدعو کیا اور میجر طفیل شہید کی رسم بسم اللہ ادا کی گئی۔ گویا ابتداء ہی سے حق و صداقت سے روشناس کرایا گیا اور اسی عظیم ذات بابرکات سے آغاز کرایا جس کے قبضۂ قدرت میں نظام ارض و سما اور گردش لیل و نہار کے علاوہ کلِ شئیٍ قدیر ہے۔ اس تقریب کے بعد میجر طفیل کو پیر و مرشد کی زیرِ نگرانی شام چوراسی کے مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے انہوں نے امتیازی طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جالندھر کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے اور ایف اے بھی پاس کر لیا۔ ان کے والد چوہدری موج دین کی خواہش بیٹے کو گریجوایٹ بنانے کی تھی لیکن میجر طفیل کو فوج میں جانے کا جنون سا تھا، لہٰذا ان کی اس خواہش کو دیکھتے ہوئے ان کے والد نے اپنا ارادہ بدل دیا اور انہیں فوج میں جانے کی اجازت مل گئی۔

میجر طفیل جب فوج میں ملازمت کے بعد عملی زندگی میں داخل ہوئے تو اس کے ساتھ ہی ان کی شادی کی بات چل نکلی۔ چنانچہ اپنے ہی خاندان کی عصمت مآب، نیک دل، نیک سیرت خاتون نیاز بی بی سے ان کی شادی کر دی گئی جن کے بطن سے صرف ایک بیٹی ہوئی۔ جس کی شادی میجر طفیل شہید کے بھائی اقبال محمد کے صاحبزادے محمد اختر سے 2 مئی 1971ء میں ہوئی۔ محمد اختر میجر طفیل شہید کے منہ بولے بیٹے تھے جنہیں میجر صاحب ہی نے تعلیم دلوائی اور فوج میں بھرتی کرایا۔ آج کل وہ پنجاب رجمنٹ میں بحیثیت میجر کے تعینات ہیں۔

میجر طفیل بڑے صحت مند اور وجیہہ جوان تھے۔ بھرا بھرا گٹھا جسم، کشادہ سینہ، موٹی موٹی آنکھیں، گندمی چہرہ اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ آواز میں ایک گرج اور دبدبہ تھا۔ بڑے خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ ان کی شخصیت کا سحر دوسروں کو مسحور کر دیتا تھا۔ چہرے پر صدا بہار مسکراہٹ تھی۔ یہ ان کی ذہانت کا کمال تھا کہ ہر شخص سے اسی کے مزاج کے موافق گفتگو کرتے تھے۔ والدین کا بڑا احترام کرتے یہاں تک کہ معمولی سے معمولی کام میں بھی ان کی اجازت اور رضامندی کو ضروری خیال کرتے۔ بڑے فیاض اور دریا دل تھے لیکن جب کسی کی امداد کرتے تو دوسروں سے چھپا کر۔ ان کے سخاوت کے کئی ایسے واقعات ہیں جن کا ذکر ان کی شہادت کے بعد دیر بعد ان لوگوں نے کیا جنہیں میجر صاحب نے فائدے پہنچائے تھے۔ والدین کا تصور ان

کے ذہن میں بہت ارفع واعلیٰ تھا۔ اپنی کامیابی کا راز وہ والدین کی دعاؤں کو سمجھتے تھے اور کسی بھی موقع پر ان کی حکم عدولی نہ کرتے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمانوں کے آنے سے بہت خوش ہوتے اور گھر والوں کو ان کی خوب تواضع کرنے کو کہتے۔ کوئی ملنے کے لیے آجاتا تو اسے بغیر کھائے پیئے نہ جانے دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب چھٹی پر گاؤں آتے تو مہمانوں اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جاتا اور ایک لنگر کا سا سماں نظر آتا۔ انسانوں میں کسی درجہ بندی کے قائل نہ تھے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھتے۔ یہاں تک کہ گاؤں کا کمی کمین بھی آتا تو خندہ پیشانی سے ہاتھ ملاتے اور بغل گیر ہوتے۔ جس روز دستر خوان پر زیادہ آدمی ہوتے اسی روز انہیں کھانے میں بہت لطف آتا۔

ہر روز صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز کے بعد تلاوت کلام پاک ان کا معمول تھا۔ سیر و تفریح اور ہلکی پھلکی ورزش کے بعد غسل کرتے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد مطالعہ کرتے۔ فوجی جرنیلوں کی سوانح عمریاں اور تاریخ اسلام ان کا محبوب مضمون تھا۔ سیرت پاک پر کئی کتابیں ان کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں۔ علاوہ ازیں فوجی تاریخ، سفرنامے، تاریخی ناول، قرآن کی تفاسیر یہ ایسی کتابیں ہیں جو ابھی تک ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں اور ان کے باذوق ہونے کی دلیل ہیں۔ جب مطالعہ کرتے تو اہم چیزوں کے نوٹس بھی تیار کرتے۔ ڈائری لکھنے کے عادی تھے اور اچھے اچھے واقعات کو ضرور قلمبند کرتے۔ فرصت کے اوقات میں بچوں کو پڑھاتے۔ بچوں سے انہیں بہت پیار تھا۔ یہاں تک کہ عید پر اپنے دوستوں کو عید کارڈ بھیجتے تو بچوں کو بھی نظر انداز نہ کرتے۔ رسہ کشی کے بہترین کھلاڑی تھے اور ایک مقابلے میں کپ بھی جیتا تھا۔ لمبی دوڑ، چھلانگ، کرکٹ اور ہاکی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ لہو لعب سے شدید نفرت تھی۔ تاش، چوسر اور شطرنج جیسی بازیوں سے دور رہتے تھے۔ کبھی کبھار جب فارغ ہوتے تو پودوں کو پانی دیتے اور ان کی مناسب دیکھ بھال کرتے۔ چھٹی کے دنوں میں شکار کھیلتے۔ فوٹوگرافی کے شوقین تھے اور قدرتی مناظر کی تصاویر کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

عسکری زندگی

میجر طفیل نے جب ایف اے پاس کیا تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ والد کی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے لیکن میجر طفیل جن کی قسمت میں ملک و قوم کے تحفظ کی ذمہ داری اور شہادت جیسی نعمت لکھی گئی تھی، ان کے اٹھنے والے قدم مکتب کی بجائے محاذ کی طرف بڑھنے کو بے تاب تھے۔ چنانچہ وہ 22 جولائی 1932ء کو فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ محنت، لگن، شوق نے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ ترقی پسند طبیعت نے راستہ کی دشواریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھنے میں مدد دی۔ ان کے آفیسر ان کی کارکردگی سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے انہیں جمعدار کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور ملازمت کے آٹھ سال بعد ہی یعنی 1940ء میں انہیں صوبیدار بنا دیا گیا۔ جذبہ، ہمت اور کام کی سچی لگن نے قدموں کو رکنے نہ دیا اور 1943ء کو انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے باقاعدہ کمیشن حاصل کر لیا اور 13 جون 1943ء کو سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد تھوڑے عرصے بعد 11 نومبر 1944ء کو فل لیفٹیننٹ بنا دیئے گئے۔

میجر طفیل شہید اپنی اصول پسندی اور خداداد صلاحیتوں کے باعث اپنے افسروں کی نگاہوں میں تھے۔ جو ہر مشکل اور پیچیدہ مسئلے میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ افسروں نے یہ محسوس کر لیا ہے، وہ ایک بہترین اتالیق کی حیثیت میں بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 28 مارچ 1945ء کو انہیں ٹریننگ کیپٹن بنا دیا گیا۔ اس میدان میں بھی ان کی صلاحیتیں چھپی نہ رہ سکیں۔ ان کی ترقی پسند طبیعت نے یہاں بھی انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے ٹریننگ کے وہ طریقے رائج کیے جو بالکل نئے تھے اور جو آج بھی انہی کے نام کی نسبت سے رائج ہیں اور "طفیل میتھڈز آف ٹریننگ" (Tufail,s Methods of Training) کہلاتے ہیں۔ 1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو وہ میجر بن گئے۔ اس کے بعد اپریل 1948ء کو سیکنڈ بٹالین آف پنجاب رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر مقرر ہو گئے۔ ان دنوں گلگت میں سکاؤٹس کی تنظیم نو کی جا رہی تھی۔ اس کی نگرانی کے لیے میجر طفیل کو گلگت جانا پڑا جہاں گلگت سکاؤٹس کے کمانڈنٹ آفیسر بنے اور بلاشبہ پہلے پاکستانی تھے جو اس اعزاز کے حقدار بنے۔ یہاں انہوں نے سکاؤٹس کو سرحدی دفاع کی تربیت دی۔ گلگت میں وہ چار سال تک رہے۔ اپنی محنت اور جانفشانی کی بدولت یہاں بھی انہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی اور سکاؤٹوں کی وہ جماعت اوائل میں جن کی

تعداد پانچ سو کے قریب تھی، بڑھتے بڑھتے ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی۔

میجر طفیل شہید کو ایک کامیاب آفیسر کے علاوہ ایک ذہین اور مثالی انسٹرکٹر بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے جب کوہاٹ میں آفیسرز ٹریننگ سکول کا اجراء ہوا تو میجر طفیل ہی کو کمانڈنگ آفیسر بنا کر کوہاٹ بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ اپنے یونٹ میں واپس چلے گئے اور اس کے جشن صد سالہ میں شامل ہو کر رونق افزائی کا باعث بنے۔

ان دنوں بھارت کی حکومت اپنی روایات کے مطابق حریص نظروں سے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو اپنے قبضے میں کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ اس نے کھلم کھلا اس علاقہ میں اپنا عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ لاتوں کے بھوت کو جب باتوں کا اثر نہ ہوا تو پاکستان کی حکومت جوابی کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ چنانچہ جون 1958ء کو میجر طفیل شہید کو ایسٹ پاکستان رائفلز میں بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہیڈ کوارٹر اکھوڑہ ضلع کومیلا میں ونگ کمانڈر مقرر ہوئے اور اگست 1958ء میں لکشمی پور کے معرکے کی کمان اپنے ہاتھوں میں لی۔ یہی وہ معرکہ ہے جس میں دشمن کو تہس نہس کرتے ہوئے وہ شہادت کی منزل تک پہنچے۔

معرکہ لکشمی پور

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے میجر طفیل ایسٹ پاکستان رائفلز میں شامل ہوئے تھے جسے ای، پی آر بھی کہا جاتا تھا، یہ وہ شعبہ تھا جس کے ذمہ سرحدوں کی حفاظت اور سمگلنگ کی روک تھام سے لے کر ملک کے اندر امن وامان برقرار رکھنے اور سازشوں کا قلع قمع کرنے کے اہم فرائض شامل تھے اور اس کے جوانوں نے قیام پاکستان سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان تک جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں جو کارنامے ادا کیے، وہ تاریخ کا ایک زریں باب ہیں۔ ای پی آر نے مشرقی پاکستان کی نہ صرف پندرہ سو میل لمبی سرحد کی دیکھ بھال کی بلکہ ہندوستانی سمگلروں کا دھندا بھی چوپٹ کیے رکھا اور کسی موقع پر بھی ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ اس کے جوانوں نے نہ صرف سمگلنگ شدہ مال پر قبضہ کیا بلکہ کئی حریص سمگلروں کو گرفتار کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچا کر اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیا۔ ہندوستان شروع

ہی سے چور دروازوں سے مشرقی پاکستان کی پٹ سن کے حصول کی کوششیں کرتا رہتا تھا اور اس کے لیے سمگلروں کو اس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ای پی آر کی فرض شناسی کے باعث ایسا نہ ہو سکا اور اسے کافی نقصان بھی اٹھانا پڑا تو وہ ایک زخم خوردہ ناگ کی طرح بپھر گیا اور اس تاک میں رہا کہ ای پی آر کی نظر بچا کر حملہ کرے۔ جب اس کی ہر تدبیر ناکام ہو گئی تو اس نے سرحدی جھڑپوں کا آغاز کر دیا۔ مکار دشمن نے تخریبی کارروائیوں سے کافی جانی ومالی نقصان کیا۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور امن و آشتی کی راہیں ہموار کرنے کے لیے حکومتوں کے سرکردہ ممبران کی بات چیت بھی ہوئی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور حالات بدستور بگڑتے چلے گئے۔

اس نازک صورتحال کے پیش نظر اس بات کی ضرورت تھی کہ ای پی آر کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنایا جائے تاکہ مکار دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ جولائی 1958ء میں بریگیڈیئر صاحب داد ای پی آر کے ڈائریکٹر جنرل بنے اور انہوں نے ای پی آر کی تنظیم نو کی۔ اس سلسلہ میں جنرل امراؤ خان کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے جی او سی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر کوششوں اور جوانوں کے تعاون سے ای پی آر کو مضبوط تر بنا دیا۔ ان دنوں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے میجر جنرل امراؤ خان نے ایک بار بتایا تھا کہ مشرقی پاکستان میں سمگلروں نے اپنی کارروائیاں تیز تر کر کے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ سمگلروں کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے اور اس کا سبب بااثر افراد اور مالدار طبقے کی پشت پناہی تھا۔ سمگلر کھلے بندوں غلہ، کپڑا، سونا، دوائیاں، گندم اور چاول وغیرہ ہندوستان میں منتقل کر رہے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نہ صرف ان حالات پر قابو پایا جائے اور ملک کی حفاظت کی جائے بلکہ سمگلروں کا قلع قمع کیا جائے۔ یہی ذمہ داری ای پی آر کی تھی۔

ای پی آر کی فرض شناسی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سمگلنگ پر قابو پا لیا گیا لیکن چونکہ بنیا فطرتاً سازشی اور تخریب پسند ہے، اس لیے وہ امن و شانتی کے نعرے لگا کر بین الاقوامی سطح پر ہمدردیاں سمیٹتا رہا اور ساتھ ہی نئی نئی سکیمیں سوچتا رہا۔ جب کچھ نہ کر سکا تو سونا تیلا کے راستے اپنے فوجیوں کو پاک سرزمین میں داخل کر دیا۔ پاکستانی حکومت نے اس پر احتجاج کیا اور آسام حکومت سے انہیں واپس بلوا لینے کا مطالبہ کیا۔

اس مطالبے کے باوجود آسام حکومت نے کوئی نوٹس نہ لیا اور پاکستان کے مسلسل احتجاج کے باوجود 20 جولائی 1958ء کو اپنی باقاعدہ فوج پاک سرحدوں پر جمع کر دی اور آس پاس کی پہاڑیوں میں اسلحہ کے انبار لگا دیئے۔ اس سے حالات اور بگڑ گئے۔ ظاہر ہے ہندو حکومت کی نیت ٹھیک نہ تھی۔ مشرقی پاکستان کی حکومت نے ہندوستان کی حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس جارحیت کے خطرناک اثرات سے آگاہ کیا لیکن ہندوستان کی حکومت لیت و لعل سے کام لیتی رہی۔ دشمن کے حوصلے اتنے بڑھے کہ 2 اگست 1958ء کی شب کو وہ پاکستانی علاقے برہمن باڑیہ کے سرحدی گاؤں لکشمی پور میں گھس آیا اور اس پر جارحانہ طور پر قابض ہو گیا اور اس کی ملکیت کا دائی بن گیا۔ حالانکہ دنیا جانتی تھی کہ 1958ء میں دونوں ملکوں کے باہمی تصفیہ سے لکشمی پور پاکستان کے حصے میں آ گیا تھا۔

جس وقت لکشمی پور کا گاؤں پاکستان کے حصے میں آیا تھا تو وہاں ایک ہندو مہاجن جو علاقے کا سب سے بڑا مالدار اور سمگلر تھا، اس نے بہت واویلا مچایا اور لکشمی پور سے نکل کر ہندوستان کے علاقے میں اگرتلا میں جالیا۔ وہاں جا کر اس نے عوام کو مشرقی پاکستان کے بارے میں خوب اشتعال دلایا۔ مسلمانوں کے جھوٹے واقعات بیان کئے۔ ہندوؤں کی کسمپرسی اور بیچارگی کا رونا رویا۔ مشرقی پاکستان کی حکومت کے ظلم و تشدد کے قصے سنائے۔ ساتھ ہی اس گاؤں کی سرحدی اہمیت کو بیان کیا اور ہندوستانی فوجی افسروں کو اس گاؤں پر قابض ہو جانے پر مجبور کیا۔ اس تمام کارروائی سے اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ لکشمی پور کا گاؤں ہندوستان کے قبضے میں آ کر ای پی آر کے دفاعی اقدامات سے نجات حاصل کر سکے اور اس کا سمگلنگ کا کالا کاروبار پھر ترقی پذیر ہو۔ ہندوستان میں وہ بنیا یہ سب منافرت پھیلانے کے بعد دوبارہ لکشمی پور میں آ بسا اور یہاں کے ہندوؤں کو اکسانے لگا اور درپردہ وہاں کی حکومت کا باغی بنا دیا۔ دوسری طرف فوجیوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ میجر دیو برمن کی سرکردگی میں ایک سو مسلح افراد لکشمی پور میں داخل کر دیئے۔ ان لوگوں نے وہاں کے مقامی ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے۔ یہاں تک کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔
میجر دیو برمن کے وحشی ساتھیوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ سوچی سمجھی سکیم

کے تحت وہاں مورچہ بندی شروع کر دی۔ اب لکشمی پور دشمن کے قبضے میں تھا اور وہاں کے لوگ وطن دوستی کی پاداش میں جرم ناکردہ کے سزاوار تھے۔

میجر جنرل محمد امراؤ خاں پہلے ہی ہندوؤں کی سرگرمیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور جب انہیں اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے دشمن کو یہ علاقہ خالی کر دینے کا نوٹس دیا لیکن بے شرم دشمن اپنی ہٹ دھرمی سے انکار کر گیا۔ اس پر پاکستانی حکام مجبور ہو گئے کہ نہ صرف اس علاقے میں سے دشمن کو مار بھگایا جائے بلکہ اسے ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ وہ آئندہ کے لیے ایسی جرأت کا سوچ بھی نہ سکے۔
میجر جنرل امراؤ خاں نے بریگیڈیئر صاحب داد کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ لکشمی پور پر حملہ کر دیں اور اس علاقے کو ای پی آر کی مدد سے دشمن کی دستبرد سے نجات دلائیں۔

3 اگست 1958ء کو جب بریگیڈیئر صاحب داد کو لکشمی پور سے دشمن کے انخلا کا حکم ملا تو انہوں نے فوری اس کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ حالات کچھ اس قسم کے پیچیدہ ہو چکے تھے کہ ایک نہایت شاطر اور کمینے دشمن کا مقابلہ اور اسے شکست دینا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب داد نے اپنے تجربے اور ذہانت کی بنا پر میجر طفیل کو منتخب کیا اور اس مہم کی کمان ان کے ہاتھ میں دے دی۔ ساتھ ہی انہیں وسیع اختیارات سونپ دیئے اور اجازت دی کہ وہ مہم کو سر کرنے کے لیے جو کارروائی مناسب سمجھیں کریں۔ میجر طفیل نے مختلف کمپنیوں سے چند آدمی منتخب کئے اور ایک منصوبہ بنایا جس سے انہوں نے بریگیڈیئر صاحب داد کو بھی مطلع کر دیا۔ جب سارا پروگرام مکمل ہو گیا تو 6 اگست 1958ء کو انہوں نے اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب یہ کام وطن عزیز اور ناموس کے لیے کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں میں کسی پر سختی یا زبردستی کا قائل نہیں۔ اگر کوئی اس مہم میں ساتھ دینے کو ناپسند کرتا ہے یا اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے تو بے شک پیچھے لوٹ جائے اور جو کوئی خوشی سے وطن کی آن پر قربان ہونا چاہتا ہے، وہ آگے بڑھ آئے۔
میجر طفیل نے دیکھا کہ مجاہدین کے چہرے تمتما اٹھے ہیں اور وہ سب کے سب آگے بڑھ آئے ہیں تو انہیں بے حد مسرت ہوئی۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اور ساتھیوں کے اس جذبہ جہاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وہ کہنے لگے کہ مجھے پورا یقین تھا کہ

آپ میں سے ہر شخص اپنے وطن عزیز کے لیے بڑی سے بڑی قربانی بھی دینے کو تیار ہے۔ انشاء اللہ ہم دشمن پر فتح پالیں گے۔

میجر طفیل تمام حالات کو بخوبی جان چکے تھے اور دشمن کی دفاعی پوزیشن سے اچھی طرح باخبر تھے۔ دشمن نے لکشمی پور کی ایک اہم ٹیکری پر اپنا مورچہ بنالیا تھا جس کے اطراف میں پانی ہی پانی تھا۔ صرف ایک راستہ تھا اس پر بھی اس نے مشین گنیں نصب کی ہوئی تھیں۔ اس ٹیلے سے تخریبی سرگرمیوں کے علاوہ ہندوستانی فوج کو پاکستانی مجاہدوں کی تمام نقل و حمل کا بھی پتہ چل جاتا تھا۔ میجر طفیل نے پروگرام بنایا کہ تین پلاٹونوں کے ذریعے دشمن پر حملہ کیا جائے یعنی دو پلاٹونیں تو مختلف جگہوں پر حملہ کریں اور تیسری پلاٹونوں ہندوستانی علاقے میں سے چکر کاٹ کر حملہ آور ہو۔

تیسری پلاٹون کا کام سب سے اہم اور خطرناک تھا اور شکست و کامیابی کا انحصار اسی پلاٹون کی کارکردگی پر تھا۔ میجر طفیل شہید نے اسی پلاٹون کی قیادت کا ذمہ لیا اور جمعدار محمد اعظم کو اپنا نائب بنایا۔ 4 اگست 1958ء کی شام میجر طفیل نے حملے سے متعلق احکامات جاری کیے اور ساتھیوں کو اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان انتظامات میں رات ہو گئی۔ میجر طفیل نے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا اور وطن پر فدا ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے خود تیسری پلاٹون کو ساتھ لیے رخصت ہو گئے۔ میجر طفیل یہاں سے ہٹ کر دس میل دور اکھوڑہ ریلوے سٹیشن کی جانب گئے اور اسی رات یہ دستہ ریل کے ذریعے لکشمی پور سے دو میل ادھر آگیا۔ اسی اثناء میں پاکستانی فوجیوں کا دوسرا گروپ جمعدار محمد اعظم کی قیادت میں بھارتی فوجیوں کے مقابل آ چکا تھا۔ رات نے اپنا دامن کچھ اس طرح پھیلایا تھا کہ کائنات اس کی لپیٹ میں بری طرح آچکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ میجر طفیل کے پلاٹون کو پیچھے کی جانب سے حملہ آور ہونا تھا۔ دشمن کو بے خبر رکھنے کے لیے ان کے ساتھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ زندگی اور موت دونوں شانہ بشانہ چل رہی تھیں۔ سانس بھی زور سے آتا تو رات کے سناٹے میں اس کی آواز چاروں طرف پھیل جاتی۔ میجر طفیل شہید اپنے ساتھیوں سمیت دیوانہ وار آگے بڑھ کر دشمن کو دبوچ لینے کو بے قرار تھے۔

مکار دشمن باخبر ہو چکا تھا اور گھات میں بیٹھا تھا۔ بزدل اسلحہ اور فوج کی کثرت

کے باوجود ہراساں ہو گیا تھا۔ جونہی میجر طفیل نے حملے کا حکم دیا، مجاہدین اللہ کا نام لے کر حرکت میں آگئے۔ فضا اللہ اکبر اور یا علی مدد کے نعروں سے گونج رہی تھی اور زندگی اور موت کا کھیل زوروں پر تھا۔

پوزیشن سے پندرہ گز کے فاصلے پر دشمن نے ہلکی مشین گن سے فائرنگ شروع کر دی۔ میجر طفیل اپنی پلاٹون کی بالکل پہلی صف میں تھے۔ اس لیے گولیوں کی پہلی ہی بوچھاڑ سے وہ زخمی ہو گئے اور یکے بعد دیگر تین گولیاں ان کے پیٹ میں لگیں اور پیوست ہو گئیں۔ ایک ہی گولی کا زخم نا قابل برداشت ہوتا ہے اور عزم و ہمت کے تمام جذبے دم توڑ دیتے ہیں لیکن یہاں تین گولیاں عزم صمیم کو اور پختہ کر گئیں اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری اور ہوش مندی سے ایک دستی بم پھینک کر غنیم کی مشین گن اور اس کے ارد گرد کے مرداروں کو خاکستر بنا دیا۔ بوکھلائے ہوئے دشمن نے ایک اور مشین گن سے فائر شروع کر دیا۔ اللہ اکبر کی ایک صدا بلند ہوئی۔ یہ میجر طفیل کے جانثار ساتھی محمد اعظم کی آواز تھی جو مشین گن کے فائر کی زد میں تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ میجر طفیل اپنے ساتھی کی اس موت پر تلملا اٹھے۔ خون بہہ جانے سے وہ کمزوری محسوس کرنے لگے تھے لیکن عزم و ہمت ہر کمزوری پر غالب تھی۔ وہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک دستی بم سے جمعدار محمد اعظم کی قاتل مشین گن کے پرخچے اڑا دیئے۔

اب میجر طفیل اور ان کے ساتھی دشمن کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے جسم سے خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا لیکن وہ اس کے باوجود اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے انہیں جوش دلا رہے تھے۔ ان میں پہلے سے زیادہ پھرتی اور تیزی عود آئی تھی۔ دشمن کو قریب پا کر میجر طفیل اور ان کے ساتھی اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے دشمن کو ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس دست بدست لڑائی میں مکار اور بزدل دشمن ٹھہر ہی نہ سکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ پاکستان کے شیر آج تمام حساب چکانے کے موڈ میں تھے، اس لیے وہ بھاگتے ہوئے دشمن کی راہ روک رہے تھے۔ میجر طفیل شہید کے جسم سے خون کی رہی سہی مقدار بھی نکل چکی تھی اور وہ زخموں سے چور زمین پر گرے

ہوئے تھے۔ اسی دوران انہوں نے دشمن کے کمانڈر دیو برمن کو مورچے سے نکلتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ایک نوجوان پر حملہ آور ہونے والا تھا۔ میجر طفیل نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن ان سے اٹھا نہ گیا۔ انہوں نے اپنے جوان کو بچانے کے لیے بھارتی کمانڈر کو ٹانگوں کے اڑنگے میں لے کر زمین پر گرا لیا اور اپنی فولادی ٹوپی سے اس کے سر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ اسی دوران میجر طفیل کے ایک ساتھی نے یہ دیکھ لیا۔ اس نے پستول نکالا اور قریب تھا کہ وہ بھارتی کمانڈر کا خاتمہ کر دیتا کہ میجر طفیل نے اس کو منع کر دیا اور اسے دوسرے قیدیوں کی طرح قیدی بنا لینے کا حکم دیا۔

ان کے ساتھیوں نے جب میجر صاحب کو اتنا زخمی دیکھا تو ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے ساتھیوں کو چوکس رہنے اور مورچوں کو سنبھالنے کا حکم دیا۔ دشمن پسپا ہو کر بھاگ چکا تھا۔ میجر صاحب نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ مورچوں پر ڈٹے رہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مورچوں کا معائنہ کریں گے۔ چنانچہ بے حد نقاہت کے عالم میں وہ اٹھے لیکن چند قدم چلنے کے بعد گر گئے۔ ان کے ساتھیوں نے جب یہ دیکھا تو فوراً سٹریچر پر ڈال کر خیمے میں لے آئے۔ عساکر پاکستان کے اس فقید المثال کارنامے اور کامیابی کی اطلاع اعلیٰ حکام کو مل چکی تھی۔ چنانچہ افسر میجر طفیل سے ملنے کے لیے فوراً خیمے میں پہنچے۔ اپنے افسروں کو دیکھ کر میجر صاحب نے ہمت کر کے انہیں آخری بار سلیوٹ کیا اور اپنی زبان سے فتح و کامرانی کی خوشخبری سنائی۔

جلد ہی انہیں ٹرین کے ذریعے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال کومیلا پہنچایا گیا۔ جاتے وقت میجر صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر پاکستانی پرچم کو سلامی دیتے رہے۔ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے فوری آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپریشن کے ذریعے ان کے پیٹ سے چار گولیاں نکالی گئیں۔ آپریشن مکمل کرنے کے بعد ابھی ٹانکے لگائے جا رہے تھے کہ ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے لاکھ جتن کیے، اپنی تمام قابلیت کو آزما ڈالا لیکن میجر طفیل شہید ملک عدم کو سدھار چکے تھے۔ یہ 7 اگست 1958ء کا روز تھا۔ مشرقی پاکستان کو یہ کامیابی میجر طفیل شہید کی اعلیٰ قیادت، جانبازی اور عالی ہمتی کی دولت نصیب ہوئی تھی۔ پاکستان کو اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس مل گیا تھا اور اس کی فضاؤں میں پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ میجر طفیل شہید کے اس غیر متزلزل جذبہ حب الوطنی اعلیٰ درجے کے احساس فرض اور شجاعت و بلند ہمتی کی بنا پر انہیں "نشان حیدر" کا اعزاز ملا۔ انہوں نے قربانی کی ایسی مثال قائم کی جو دوسروں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی۔

تاثرات

کرنل عبدالحمید اور میجر محمد یونس جنہوں نے سی ایم ایچ کومیلا میں میجر طفیل شہید کا آخری آپریشن کیا، شہید کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"شہید کو جس وقت ہسپتال لایا گیا تو وہ بہت ہشاش بشاش تھے۔ ان کے چہرے پر کرب و اذیت کا نشان تک نہ تھا۔ ان کے اس حوصلے اور اطمینان کو دیکھ کر ہم یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحے ہیں بلکہ خود میجر صاحب کا کہنا تھا کہ وہ چند دنوں تک ٹھیک ہو کر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے۔"

بریگیڈیئر صاحب داد یوں رقمطراز ہیں:

"میجر طفیل شہید ایک مثالی مسلمان اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ غیر شرعی اور دنیاوی لہو و لعب سے انہیں بالکل دلچسپی نہ تھی۔ جہاں انہیں تعین کیا گیا تھا، وہاں سمگلروں کا زور تھا اور سمگلروں کے لیے دولت سے خرید لینا بہت آسان تھا لیکن میجر طفیل نے اس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ ایسے افسر پر مجھے ناز ہے جو اتنے اونچے کردار کا مالک ہو۔"

لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی میجر طفیل شہید کے ہمراہ کافی عرصہ رہے ہیں۔ شہید کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"وہ پانچ وقت کے نمازی تھے اور بہت ہر دلعزیز تھے۔ بے حد شریف، نیک مزاج، بہادر اور بلند ہمت تھے۔"

تیسرا نشانِ حیدر

میجر عزیز بھٹی شہید

کیڈٹ کالج کے تربیتی کورس کے چند لڑکے ایک سبق کے متعلق پمفلٹ لانا بھول گئے تھے۔ انسٹرکٹر کو جب علم ہوا تو اس نے گوشمالی کی غرض سے سینئر کیڈٹ کو ایسے تمام لڑکوں کے نام نوٹ کرنے کو کہا۔ سینئر کیڈٹ نے حکم کی تعمیل کی اور فہرست تیار کر کے چپکے سے انسٹرکٹر کے ہاتھ میں دے دی۔ انسٹرکٹر نے اس فہرست کو ایک نظر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس میں سرفہرست سینئر کیڈٹ نے اپنا نام لکھا تھا۔

کلاس میں انٹیلی جنس کے موضوع پر ایک اہم لیکچر دیا جا رہا تھا۔ تمام بڑے لڑکے انہماک سے لیکچر سن رہے تھے۔ اچانک لیکچرار کی نظر ایک ایسے لڑکے پر پڑی جو آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ لیکچرار نے دور ہی سے چاک کا ایک ٹکڑا اس کی طرف پھینکا اور گرجدار آواز میں کہا:

"تم سو رہے ہو؟"

"نو سر۔" لڑکے نے ہڑبڑا کر جواب دیا۔

"میں نے خود دیکھا ہے۔" لیکچرار نے قدرے درشتی سے کہا۔

"نو سر میں تو لیکچر سن رہا تھا۔" لڑکا اپنی بات پر بضد تھا۔

لیکچرار نے جب دیکھا کہ لڑکا اتنی خود اعتمادی سے جواب دے رہا ہے تو اس نے لڑکے کو لیکچر دہرانے کو کہا۔ لڑکے نے وہاں کھڑے ہو کر لیکچر دہرانے کی بجائے سٹیج پر آنے کی خواہش ظاہر کی اور اس اجازت کے ملتے ہی اس نے پوری کلاس کے



میجر راجہ عزیز احمد بھٹی شہید نشانِ حیدر

سامنے اتنی خود اعتمادی اور خوبصورتی سے لیکچر دیا کہ سبھی دنگ رہ گئے۔

کیڈٹ کالج کا سینئر کیڈٹ اور کلاس کے سامنے لیکچر دہرانے والا ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام عزیز بھٹی تھا جس نے اپنے ایمان محکم اور عزم صمیم کی بدولت دشمن کے لشکر جرار کے سامنے آہنی حصار کھینچ کے رکھ دیا۔ یہ وہ عزیز بھٹی ہے جو ارض پاک کے ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گیا اور اپنی فرض شناسی، جانثاری اور شجاعت کی ایسی مثال چھوڑ گیا جن کے تذکرے سے تاریخ کے اوراق سدا جگمگاتے رہیں گے اور جس نے بہادری کا سب سے بڑا اعزاز "نشان حیدر" حاصل کیا۔

خاندان

میجر راجہ عبدالعزیز بھٹی شہید نشان حیدر معزز راجپوت بھٹی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور راجپوتوں کی روایتی اولوالعزمی، شجاعت، مردانگی، بہادری اور جرأت کے مالک تھے۔ میجر عزیز بھٹی کا گھرانہ اپنی اسلام پسندی اور مذہبی رواداری میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے دادا قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسی صفات کے مالک تھے اور دادی کی شخصیت شب بیداری اور تہجد گزاری کی بنا پر پورے خاندان کے لیے موجب رحمت تھی۔ ان بزرگوں کے یہی اوصاف جمیلہ ان کے بیٹے محمد عبداللہ ولد عزیز بھٹی کو ورثے میں ملے۔ محمد عبداللہ 1889ء میں ضلع جہلم کے ایک گاؤں لادیاں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قدیم گاؤں مغل بادشاہ اکبر کے دور میں آباد ہوا تھا۔ کچھ عرصہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں رہنے کے بعد دوبارہ لادیاں چلے آئے۔ اس زمانے میں تلاش معاش کے سلسلہ میں لوگ بیرونی ممالک آ جا رہے تھے۔ چنانچہ راجہ محمد عبداللہ بھی ہانگ کانگ چلے گئے لیکن رخصتی سے پہلے انہیں شادی جیسے فرائض سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ہانگ کانگ میں انہوں نے کوئی کاروبار کرنا چاہا لیکن سازگار حالات میسر نہ آنے کی وجہ سے وہاں نیول پولیس (سمندری فوج) میں بھرتی ہو گئے۔ یہ ملازمت چونکہ طبیعت کے موافق نہ تھی اور رجحان طبع درس و تدریس کی طرف تھا، اس لیے فوج کی ملازمت چھوڑ کر محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے اور اکیس بائیس سال یعنی 1934ء تک اسی کام پر مامور رہے۔ یہیں 6 اگست 1923ء کو پیر کے روز میجر عزیز بھٹی

کا جنم ہوا اور پہلے دو بھائیوں نذیر احمد اور بشیر احمد کے ناموں کی نسبت سے ان کا نام عزیز احمد رکھا گیا۔ گھر والے انہیں عزیز احمد کی بجائے لاڈ سے "راجہ" کے نام سے پکارتے تھے۔ ہانگ کانگ کے ماحول نے ان کی شخصیت پر پورا پورا اثر کیا۔ کھلے سمندر، بلند پہاڑوں، وسیع میدانوں نے ان میں فراخدلی، محنت اور سخت کوشی جیسی صفات کو پیدا کر دیا تھا۔

عزیز بھٹی کے چھ بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی کی ولادت 12 ستمبر 1918ء کو ہوئی۔ ان کا نام نذیر احمد ہے جو آج کل پاکستانی سفارت خانے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان سے چھوٹی ہمشیرہ محترمہ نذیر بیگم 8 ستمبر 1920ء کو پیدا ہوئیں اور کموڈور محمد اشرف بھٹی کی اہلیہ ہیں۔

دوسرے بھائی بشیر احمد 28 جنوری 1922ء کو تولد ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اپنی گوری رنگت کی وجہ سے انگریز ہونے کے شبہ میں جاپانیوں کے ہاتھوں بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ عزیز احمد کے چھوٹے بھائی سردار احمد 19 ستمبر 1924ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا شمار پاک فضائیہ کے شاہینوں میں ہوتا ہے۔ دوسری ہمشیرہ رشیدہ بیگم ملٹری آفیسر فضل کریم کی رفیقہ حیات ہیں اور سب سے چھوٹے بھائی رشید احمد جن کی تاریخ پیدائش 20 نومبر 1934ء ہے۔ شاہنواز لمیٹڈ میں انجینئر ہیں۔

ابتدائی حالات

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ میجر عزیز بھٹی ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے انہیں ایلس کدوری سکول ہانگ کانگ میں داخل کرا دیا گیا۔ اسی سکول میں ان کے والد محمد عبداللہ ایک ٹیچر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ یہ سکول صرف مڈل کلاس تک تھا۔ اس لیے میٹرک کے لیے انہیں کوئنز کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ جونہی انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات واضح ہونے لگے۔ جاپان نے ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا اور مجبوراً انہیں سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جاپانی بحریہ میں واچ مین کی پوسٹ پر مامور ہو گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کرتے ہوئے ہیڈ واچ مین سے بھی آگے نکلتے ہوئے کپتان کے کورس

کی عملی تربیت لینے لگے۔ اسی دوران جاپان کو شکست ہو گئی اور یہ خاندان جاپان دشمنوں کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ یہاں تک کہ ان کے بھائی بشیر احمد کو قتل کر دیا اور انہی مظالم سے تنگ آکر یہ کنبہ دسمبر 1945ء کو دوبارہ لادیاں (پاکستان) آگیا۔

پاکستان آنے کے بعد اگلے ہی سال جون 1946ء کو 23 برس کی عمر میں میجر عزیز بھٹی کی شادی کر دی گئی۔ یہ شادی متحدہ ہندوستان کے سابق نائب صوبیدار کرم الدین بھٹی کی دختر نیک اختر سے ہوئی جن کا نام میجر عزیز بھٹی نے "زرینہ" تجویز کیا کیونکہ ان کی ہمشیرہ سے ملتا جلتا تھا۔ زرینہ اختر کے بطن سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ میجر عزیز کے سب سے بڑے صاحبزادے ظفر جاوید سینئر کیمرج کرنے کے بعد اپنے والد کی وصیت کے مطابق فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔ میجر صاحب کے باقی بچوں کے نام ذوالفقار احمد، رفیق احمد، اقبال جاوید، رفعت آراء اور زینت آراء ہیں۔

عادات و کردار

میجر عزیز بھٹی کا جسم سڈول، مضبوط اور قد درمیانہ تھا۔ سر کے بال سیاہ اور گھنگھریالے تھے۔ جسم کی بعض خصوصیات بہت نمایاں تھیں۔ ان کے کندھوں اور جسم کے اعتبار سے ان کا سر بہت بڑا تھا۔ نیم وا اور خواب آلود آنکھیں دیکھ کر یوں لگتا جیسے وہ نیم خوابی کی حالت میں ہوں یا کسی گہری سوچ میں غرق ہوں۔ دیکھنے میں وہ بہت بھولے بھالے اور سیدھے سادے نظر آتے تھے لیکن جب سکول میں داخل ہوئے تو ان کی ذہانت کا سب نے اعتراف کیا۔ بہت محنتی اور ہوشیار تھے اور اچھے نتائج کی بناء پر ہمیشہ وظیفہ اور انعامات حاصل کرتے۔ ان کی اسی قابلیت سے متاثر ہو کر کوئنز کالج کے پرنسپل نے ان کے لیے برطانوی حکومت سے وظیفے کی سفارش کی جسے منظور کر لیا گیا لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے میجر عزیز بھٹی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کی ذہانت کا اندازہ ان لیکچروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے کیڈٹ کی حیثیت سے دیئے۔ لیکچر کا طریق کار یہ تھا کہ لیکچر سے دو منٹ پہلے کسی سلپ پر موضوع لکھ دیا جاتا اور مقرر کو دس منٹ تک اس پر بولنے کے لیے کہا جاتا۔ ایک بار میجر صاحب کو "بادل" کا موضوع دیا گیا۔ ان کے ساتھی حیران اور بے قرار تھے کہ بھٹی صاحب کیا بولیں گے لیکن انہوں نے بادل پیدا ہونے کے اسباب، بادلوں کی قسمیں اور ان کی مختلف تہوں کے اثرات اس شرح و بسط سے بیان کئے کہ سب حیران رہ گئے۔ ان کے اس لیکچر نے ان کے انسٹرکٹر کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اسے لاثانی لیکچر کہنے پر مجبور ہو گئے۔

میجر عزیز بھٹی کے وہ ساتھی جو یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ عزیز بھٹی صرف میٹرک پاس ہیں، اس لیے وہ سپاہیانہ اوصاف کی وجہ سے سورڈ آف آنر (شمشیر اعزاز) تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن عملی میدان میں کوئی اعزاز یا "نارمن میڈل" حاصل نہیں کر سکتے لیکن اکیڈمی میں دو سال کے نصاب کے خاتمہ پر بھٹی صاحب نے سورڈ آف آنر اور نارمن میڈل حاصل کر کے سب کے منہ بند کر دیئے۔

میجر عزیز بھٹی نے تعلیمی میدان کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے میدان میں بھی اپنی حیثیت کو خوب تسلیم کروایا تھا۔ بچپن میں آنکھ مچولی سے بڑی رغبت تھی۔ جب سکول پہنچے تو فٹ بال، کرکٹ، ہاکی اور ٹینس کی ٹیموں میں مل کر کھیلتے رہے۔ ایک بہترین تیراک اور غوطہ زن تھے۔ کرکٹ کے تو مثالی بیٹسمین تھے۔ سکیٹنگ میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی کے دلدادہ تھے اور چھوٹی ہی عمر میں ماؤتھ آرگن بجانے لگے تھے۔ اکثر تقاریب میں وہ ماؤتھ آرگن اور ہارمونیم سے محفل میں جان ڈال دیتے۔ انگریزی اور چینی دھنیں انہیں بہت پسند تھیں اور اکثر ماؤتھ آرگن پر وہ یہ دھنیں بجایا کرتے تھے۔

چونکہ ان کی پرورش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو علم و ادب کا رسیا تھا، اس لیے مطالعہ سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ پنجابی، اردو، انگریزی، سنگاپوری اور جرمنی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا بلکہ جرمن پر تو انہیں اتنی دسترس تھی کہ فوج میں جرمن کے سرکاری ترجمان بن گئے۔ جرمن کی کئی کتابوں کا انہوں نے ترجمہ بھی کیا جس سے انہیں اچھا معاوضہ ملا۔ کثرت مطالعہ سے ان کی معلومات بہت بڑھ گئیں اور ذہن تعریف کی حد تک زرخیز ہو گیا۔ کوئی بھی موضوع ان کے سامنے آجاتا تو وہ اس پر سیر حاصل لکھ ڈالتے۔ 1949ء میں "کاکول ملٹری اکیڈمی کا جریدہ رائزنگ کریسنٹ" جاری ہوا تو اس کے لیے یادگار مضامین لکھے اور اپنی ادبی حیثیت کا لوہا منوایا۔

بعد ازاں انگریزی رسالے "تھنڈر بولٹ" کے ایڈیٹر بنے اور اس کے لیے کئی نادر مضامین تحریر کر کے انگریزی ادب میں اونچا مقام حاصل کیا۔ تاریخ ان کا دل پسند مضمون تھا اور عسکری واقعات کو وہ بہت شوق سے پڑھتے اور بعد میں دوست احباب کو سناتے۔ افسانہ اور ناول بہت کم پڑھتے۔ البتہ آپ بیتیاں، سوانح عمریاں اور جنگی واقعات سے خاص شغف تھا۔ دوسری جنگ کے بارے میں چرچل کی یادداشت کی دوسری جلد کے بہت مداح تھے۔

میجر عزیز بھٹی بہت شریف، نیک اور منکسر المزاج تھے۔ کبر و نخوت انہیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ انکساری کا عالم یہ تھا کہ عام حالات میں بھی بڑے دھیمے انداز سے گفتگو کرتے۔ اپنی ذہانت پر انہیں ہرگز گھمنڈ نہ تھا بلکہ ہر امتحان میں شرکت سے پہلے وہ دوستوں سے اپنی کامیابی کی دعائیں کراتے۔ ان کا یہ عجز اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند تھا کہ وہ ہر امتحان میں اول آتے۔ دوستوں کے عاشق تھے۔ جو بھی ان سے ملتا، ان کی پُر بہار شخصیت سے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ دوسروں کی بات بڑے غور سے سنتے اور اچھے اچھے مشورے دیتے۔ گفتگو میں بلا کی مٹھاس تھی۔ بڑے زندہ دل اور حاضر جواب تھے۔ ان کے پاس لطیفوں اور ہنسی کی باتوں کا ایک خزانہ تھا۔ دوستوں کی فرمائش پر انہیں ہارمونیم پر اپنی پسندیدہ دھنیں سناتے۔ ہمیشہ دوسروں کے لیے خود کو مصیبت میں ڈال لیتے۔ جہاں تک ہو تا حاجت مندوں کی امداد کرتے اور خوشی محسوس کرتے۔ ایک بار انہوں نے کافی روز تک ٹینس نہ کھیلا۔ دوستوں کو اس بات سے حیرت ہوئی اور انہوں نے وجہ پوچھی۔ پتہ چلا کہ ان کے پاس پیسے نہیں اور آج کل وہ ٹینس کے پیسے ایک ضرورت مند کی امداد کے لیے بھجوا رہے ہیں۔ میجر عزیز بھٹی کی زندگی انتہائی سادہ اور دوسروں کے لیے مثالی زندگی تھی۔ دوسرے ممالک میں جانے کے باوجود اور اعلیٰ درجے کی پارٹیوں میں شرکت کے باوجود ان کے پایہ عزم و استقلال میں لغزش نہ آئی اور شراب تو ایک طرف ساری عمر سگریٹ تک نہ پیا۔ بڑے پکے نمازی اور پرہیز گار تھے۔ ہر روز تلاوت کلام پاک کرتے اور احکام خداوندی اور ارشادات نبوی کی تکمیل میں مسرت محسوس کرتے۔ صاف گوئی، جرات اظہار اور بیباکی ان کا شعار تھی۔ وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد جانتے اور بے چین ہو جاتے۔ فضول خرچی سے

اجتناب کرتے لیکن ضرورت مند کو سب کچھ لٹا دیتے۔ اپنے وطن پاکستان سے انہیں بے حد محبت تھی۔ اکثر ملکی حالات کا ذکر کرتے اور ترقی کا سن کر خوش ہوتے۔ ملک کو درپیش مسائل کا بھی انہیں بخوبی احساس تھا۔ 1964ء میں جب ایوب خاں کے دور حکومت میں فوجیوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو میجر صاحب کو ہرگز خوشی نہ ہوئی بلکہ تفکرات کے گہرے سائے ان کے چہرے پر منڈلاتے ہوئے نظر آئے۔ ساتھیوں کے پوچھنے پر انہوں نے جواب دیا کہ ملک ابھی غریب ہے اور اتنی تنخواہوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

میجر عزیز بھٹی کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ بچوں سے انہیں بہت پیار تھا اور فرصت کے اوقات میں ان سے مل کر کھیلا کرتے۔ بچوں کی تعلیم میں گہری دلچسپی لیتے اور اکثر سیر و تفریح کے لیے لے جاتے۔ کبھی کسی بچے کی فرمائش رد نہ کرتے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے فراخ دلی سے خرچ کرتے اور انہیں بہتر سے بہتر ماحول مہیا کرنے کی کوشش کرتے۔ تاہم ان سب باتوں کے باوجود نظم و ضبط کے سخت قائل تھے اور کبھی بے جا لاڈ پیار سے بچوں کو بگڑنے کی اجازت نہ دیتے۔ وقت کی پابندی، ادب و آداب اور کفایت شعاری پر خاص زور دیتے۔ ان کی بیوی محترمہ زرینہ بیگم چونکہ ایک غیر متمدن گاؤں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے ان پڑھ تھیں لیکن عزیز بھٹی نے کبھی انہیں ان کی جہالت کا احساس تک نہ ہونے دیا بلکہ جب بچوں کو پڑھانے کے لیے بیٹھتے تو ساتھ اپنی بیگم کو بھی پڑھاتے۔ جب وہ اردو اور انگریزی کی ابتداء سے واقف ہو گئیں تو انہیں ایک نائٹ سکول میں داخل کروا دیا۔ خود عزیز بھٹی شام کو چھوڑنے اور لینے جاتے۔ آخر کار ان کی کوششوں سے وہ بہت کچھ سیکھ گئیں۔ میجر عزیز بھٹی چونکہ مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے سرخی پاؤڈر اور بھڑکیلے قسم کے لباسوں کی اجازت نہ دیتے تھے۔ خود زرینہ بیگم انتہائی سادہ اور نیک سیرت خاتون ہیں۔ زیادہ تر اپنے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہیں۔ اس لیے کلب یا مجلسی تقریبوں میں شرکت کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔

عزیز بھٹی بڑے بااصول تھے۔ سخت محنت کرنے کے عادی تھے اور دولت کے لالچ سے بچے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خوشی دولت سے نہیں بلکہ دل کے

اطمینان سے اور یہ اطمینان قلب یادِ خداوندی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

میجر عزیز بھٹی انسانوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے ماتحتوں کو کبھی ان سے شکایت نہ ہوئی تھی۔ افسر تو ویسے ہی ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف تھے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے ساتھی انہیں کمانڈنگ آفیسر کا چہیتا کہتے۔ اب تک کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جس نے راجہ عزیز بھٹی کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی ہو جو ان کی شان کے خلاف ہو۔ ان کے عزیز رشتہ دار، اہل خانہ اور دوست احباب آج بھی انہیں یاد کرتے ہوئے اداس ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر اقبال نے جس مرد مومن کا تصور دیا تھا، میجر عزیز بھٹی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کی گفتار ان کے کردار کے عین مطابق تھی یعنی دونوں میں ذرہ بھر بھی تضاد نہ تھا۔

عساکر پاکستان میں شمولیت

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کی شکست کا میجر عزیز بھٹی کے خاندان پر بہت برا اثر پڑا اور جرمن دوستی کے الزام میں ان پر مظالم ڈھائے گئے تو عزیز بھٹی اپنے خاندان سمیت دسمبر 1945ء کو لادیاں ضلع جہلم (پاکستان) چلے آئے۔ اس وقت مالی لحاظ سے بالکل تباہ ہو چکے تھے اور تہی دامن تھے۔ اس مفلوک الحالی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری ملازمت کی ضرورت تھی۔ میجر عزیز بھٹی کے والد ایک انگریزی سکول میں استاد مقرر ہو گئے اور خود عزیز بھٹی اور ان کے بھائی نذیر بھٹی نے بھی سکول کی ملازمت اختیار کر لی۔ حالات وقتی انقلاب کا باعث ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ انسان میں اگر فن ہو، خوبی ہو تو حالات خود ہی سازگار بن جاتے ہیں۔ میجر عزیز بھٹی گو ٹیچر کی حیثیت سے بھی کامیاب تھے لیکن یہ ان کی منزل نہ تھی۔ فوج میں جانے کی خواہش انہیں ہر دم بے قرار رکھتی۔ گھر کے حالات ذرا درست ہوئے تو انہوں نے سکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور 1946ء میں انڈین آئیر فورس میں ''ایئر مین'' بھرتی ہو گئے۔

1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو میجر عزیز بھٹی نے پاک فوج میں کمیشن کے حصول کے لیے درخواست گزاری۔ چنانچہ 21 جنوری

1948ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے منسلک ہو گئے۔ اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل پر وہ پھولے نہ سمائے اور کامیابی کے مراحل طے کرتے گئے۔ 1950ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پہلے ریگولر کورس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ میں شامل ہوئے۔ انہیں بہترین کیڈٹ کے اعزاز کے علاوہ شہید ملت خان لیاقت علی خان مرحوم نے سورڈ آف آنر (اعزازی تلوار) اور نارمن گولڈ میڈل سے نوازا۔

1950ء کے شروع میں وہ 14 اپریل پنجاب رجمنٹ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے شامل ہو گئے اور 1951ء میں اس رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر بن گئے۔ 1953ء تک یعنی دو سال انہوں نے اڈجوٹنٹ لیفٹیننٹ کے فرائض سرانجام دیئے۔ 1956ء تک وہ کیپٹن اڈجوٹنٹ، مارٹر آفیسر اور کمپنی کمانڈر جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے اور ملک و ملت کی دیوانہ وار خدمت کرتے رہے۔ 1956ء میں انہیں اعلیٰ فوجی تربیت کے لیے کینیڈا بھیجا گیا اور وہاں دس ماہ کے قیام کے بعد جب واپس آئے تو میجر بن چکے تھے۔

جولائی 1957ء سے لے کر ستمبر 1959ء تک کوہاٹ اور جہلم پاکستان میں جی ایس او II آپریشنز کی حیثیت سے مامور رہے۔ بعدازاں جون 1961ء سے جون 1964ء تک پنجاب رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے کام کیا۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے تمام مراحل جب بخوبی طے کر گئے اور سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں انسٹرکٹر بنا دیئے گئے۔ مئی 1965ء تک 17 پنجاب سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے متعین رہے۔ جب دشمن نے سرحد پاک پر حملہ کیا تو وہ 6 ستمبر 1965ء سے لے کر 12 ستمبر 1965ء تک برکی محاذ کے کمپنی کمانڈر رہے اور اسی خدمات کو بجالاتے ہوئے وطن پر قربان ہو گئے۔

معرکۂ برکی

حق و باطل کی آویزش کا جو معرکہ برکی محاذ پر دیکھا گیا، وہ تاریخ کے صفحات کا ایک زریں باب ہے۔ پاکستان کا ازلی وابدی دشمن بھارت بزعم خویش پاکستان پر غاصبانہ قبضہ کی نیت سے دیوانہ وار آگے بڑھا اور پاک فوج سے منہ کی کھا کر ایسا پسپا ہوا کہ اس

کی چیخوں کو پوری دنیا نے سنا۔

یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے دشمن سے ہے خباثت اور شرارت جس کی رگ رگ میں سما چکی ہے اور ہر آن نت نئی شرارتوں کا سوچتا رہتا ہے، اپنی اسی فطرت سے مجبور ہو کر اس دشمن نے کشمیر میں چھیڑ خانی شروع کر دی اور جب پاکستان نے اسے ٹوکا اور منع کرنا چاہا تو اپنی من مانی پر اتر آیا۔ اگست 1965ء کو جنگ کا خطرہ بڑھ گیا۔ درہ حاجی پیر، کرگل اور بجوڑ وغیرہ کے علاقے اس کے آتشیں اسلحہ سے نیست و نابود ہوئے۔ مظلوم اور نہتے کشمیری عوام مجبوراً اپنے محبوب علاقے کو چھوڑ کر مہاجرین بننے پر مجبور ہو گئے۔ ہندوستان نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے مشن کو تیز کر دیا۔ بالشت بھر کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے جنگی صورتحال کا اعلان کر دیا اور جتنے فوجی چھٹیوں پر گئے تھے، انہیں واپس بلا لیا۔

یہ صورتحال ایسی تھی کہ پاکستان کے لیے چوکس ہونا ضروری تھا کیونکہ ہندوستان کا جنگی جنون روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لیے جب ہمارے جوان آگے بڑھے تو بزدل دشمن اتنا کمزور ثابت ہوا کہ اس کی دو فوجی چوکیاں "چھمب" اور "دیو" پاکستان کے قبضے میں آ گئیں۔ ہندوستان کو اس پسپائی کی امید تک نہیں تھی بلکہ وہ تو غاصبانہ قبضے کی سوچ میں بدمست تھا۔ اپنے خوابوں کو جو اس نے اس طرح بکھرتے ہوئے دیکھا تو سٹپٹا کر رہ گیا اور اپنی فضائیہ کو حرکت میں لے آیا لیکن یہاں بھی اس کی امیدوں کے برعکس ہوا۔ ہندوستانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری جسے اپنی کثرت تعداد پر ناز تھا، اتنا سیخ پا ہوا کہ محض اپنی خفت مٹانے کے لیے بلند و بانگ اور بے بنیاد دعوے کرنے لگا۔

کشمیر میں جنگ زوروں پر تھی اور 2 ستمبر 1965ء کو چھمب کے محاذ پر پاکستان نے دشمن کے دو بکتر بند ڈویژنوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہندوستان کی فضا کی طاقت کا غرور اسی دن ٹوٹ گیا تھا جب 3 ستمبر کو بھمبر کے علاقے میں اس کے تین طیارے ہمارے شاہینوں کی زد میں آ کر تباہ ہوئے تھے۔ اسلحہ کی جس کثرت پر اسے ناز تھا، وہ بھی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ صرف چھمب کے محاذ پر بھارت کی تیرہ توپیں ہمارے قبضے میں آئیں اور اس کے علاوہ دشمن کا جانی و مالی نقصان الگ ہے۔

4 ستمبر تک کشمیر میں پاکستان کے بہادروں کا پورا غلبہ تھا اور مجاہدوں کی پیش قدمی جاری تھی۔ بھارت اپنے تمام ہتھکنڈے آزما کر عاجز آ چکا تھا اور خود ہی جنگ کا آغاز کر کے پریشان تھا۔ پاکستانی افواج دریائے توی کو عبور کر کے راجوڑی کے محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کر رہی تھیں۔ ہندوستان مجاہدوں کے کاری ضربوں کے سامنے ہیچ تھا۔ مجاہدین کے عزم و استقلال کے سامنے اس کی فوج خس و خاشاک کی طرح تہس نہس ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب 5 ستمبر کو "جوڑیاں" جیسی مضبوط چھاؤنی پر مجاہدین کا قبضہ ہوا۔ امن کی دائمی سلامتی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں کشمیر میں فوری جنگ بندی کا فیصلہ ہوا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ تمام معاملات اقوام متحدہ کے فیصلوں کے مطابق حل کیے جائیں۔ پاکستان نے اس قرارداد کا خیر مقدم کیا لیکن ہندوستان کی حالت ایک ہارے ہوئے جواریے کی سی تھی جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کو تیار تھا۔ ہندوستان کے لیے پاکستان جیسے کمزور اور چھوٹے ملک سے اپنی یہ پسپائی ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے وہ زخمی ناگ کی طرح اور بپھر گیا۔ اس نے نہ صرف سلامتی کونسل کی قرارداد کی مخالفت کی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ پاکستان سے بات چیت کے لیے قطعی تیار نہیں۔

مسلسل ہزیمت نے بھارت کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ اس نے حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے خود کو خوابوں سے بہلانا چاہا۔ کشمیر میں منہ کی کھانے کے باوجود اس کے دل سے اپنی فوجی برتری کا زعم نہ ٹوٹا اور اس نے بین الاقوامی سرحدوں کو عبور کرنا چاہا۔ بعد میں اس کے پروگراموں کی تفصیلات جب سامنے آئیں تو لوگوں نے اس کا خوب مضحکہ اڑایا۔ اس کا پروگرام 6 ستمبر کی شب جم خانہ کلب لاہور میں دعوت عشرت و طرب کا تھا اور وہ جو لاہور پر فتح کا خواب دیکھ رہا تھا، مدتوں اپنے زخموں کو سہلاتا رہا۔ 6 ستمبر کی صبح تین بجے کا وقت تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ آرام کی نیند سو رہے تھے کہ بزدل دشمن نے چپکے سے برکی اور بیدیاں کے محاذ پر حملہ کر دیا۔ نہ کوئی اطلاع اور نہ اعلانِ جنگ۔ چوروں کی طرح وار کرنے والے اس دشمن نے واہگہ، بیدیاں اور جسڑ کے مقامات پر اپنی بے شمار فوج اتار دی۔ تاریکی میں چھپ کر حملہ آور ہونے والے بزدل نے سوئے ہوئے بے گناہ عوام کو اپنے گولوں کا نشانہ بنایا اور جب اس کی وحشیانہ جبلت

کی اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو اس نے وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر ایک مسافر گاڑی پر فضا سے بم برسائے اور چند بے گناہ اور نہتوں کو شہید کر دیا۔

ہندوستان کے اس اچانک حملے سے پورے پاکستان کے عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ کیا چھوٹا کیا بڑا ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ دشمن کو ختم کر دو۔ اسی روز دن کے 11½ بجے سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے ریڈیو پاکستان سے اپنی تقریر میں ہندوستان کے اس حملے کی اطلاع دی اور جنگ کا باقاعدہ اعلان کیا۔ انہوں نے دشمن کی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پاکستانیوں کے لیے ایک آزمائش ہے اور وہ اس آزمائش میں پورا اتریں گے اور نہ صرف وہ دشمن کی تخریبی سرگرمیوں کا مقابلہ کریں گے بلکہ اسے عبرت ناک سزا بھی دیں گے اور اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دشمن کی توپوں کے دہانے ہمیشہ کے لیے سرد نہ پڑ جائیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے ہندوستانی سامراجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا وہ نہیں جانتے انہوں نے اس بہادر قوم کو چھیڑا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملک میں باقاعدہ ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا اور مجاہدین کے نام ایک خصوصی پیغام میں انہیں آگے بڑھنے اور دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا حکم دیا۔

صدر کی اس تقریر سے فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ جذبات کے تلاطم نے چہروں پر سرخی دوڑا دی۔ لوگوں کا جذب و شوق دیکھ کر قطعی یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ یہ قوم جنگ سے دوچار ہے بلکہ اس روز ایک جشن کا سماں تھا۔

بھارت نے جس وقت یہ حملہ کیا تھا، اس وقت ہماری مٹھی بھر فوجی جوان سرحدوں پر موجود تھے۔ بے حد قلت کے باوجود انہوں نے دشمن کو روکے رکھا اور بقول علامہ اقبالؒ کے

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

اسی دوران ہماری مسلح افواج حرکت میں آ گئیں۔ میجر شفقت بلوچ کی کمپنی کو ہڈیارہ اور میجر عزیز بھٹی کی کمپنی کو برکی سیکٹر میں دشمن کا مقابلہ کرنا تھا لیکن میجر عزیز بھٹی کی عدم موجودگی کی بنا پر عارضی طور پر اس کمپنی کی کمان لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں آ گئی۔

جنگ شروع ہوئی تو ان دنوں میجر عزیز بھٹی چھٹی پر تھے۔ 6 ستمبر کی صبح حسب معمول وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتے کے بعد اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک حوالدار جیپ میں سوار ان کے پاس آیا اور ان کے چھٹی کی تنسیخ کے علاوہ محاذ پر پہنچنے کا پیغام دیا۔ میجر صاحب نے اسی وقت اپنے اردلی کو تیاری کا حکم دیا اور لوگوں سے ملنے لگے۔ محاذ پر جانے کی خوشی اور جنگ میں شمولیت کا شوق ان کے چہرے سے ہویدا تھا۔ رخصتی کے وقت جب انہوں نے اپنی رفیقہ حیات کو غمزدہ دیکھا تو مسکراتے ہوئے انہیں سمجھانے لگے اور خوشی سے رخصت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کے الوداعی الفاظ وطن کی محبت سے لبریز تھے اور دشمن کے اچانک حملہ کا ذکر کرتے ہوئے چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر تقریباً ساڑھے سات بجے کے قریب محاذ پر پہنچے۔ ساتھیوں نے جب انہیں جیپ سے اترتے ہوئے دیکھا تو دلوں میں خوشی کی اک لہر دوڑ گئی۔ عقیدت و محبت کے عالم میں وہ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میجر عزیز بھٹی نے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک ولولہ انگیز اور جوشیلی تقریر کی۔ پاک وطن کے سربکف مجاہد پہلے ہی دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کو بے تاب تھے۔ میجر عزیز بھٹی کے ان الفاظ نے ایک نیا عزم عطا کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کی پلاٹون میں گئے۔ ان کے جوان بھی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے دشمن کی راہ روکے ہوئے تھے۔ میجر عزیز بھٹی نے یہاں کے جوانوں کی بھی ہمت بڑھائی۔ لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کو چند ضروری ہدایات دیں اور محاذ کا جائزہ لیا۔ اسی وقت انہیں پتہ چلا کہ دشمن ہڈیارہ کی طرف سے پیش قدمی کر رہا ہے اور تقریباً چھ ہزار گز کے فاصلے پر تھا۔ میجر عزیز بھٹی نے دوربین کے ذریعے پوزیشن کا اندازہ لگایا اور فائر کا حکم دے دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ پاکستانی توپ خانہ حرکت میں آ گیا اور ایسے نشانے پر گولے برسائے کہ سوائے چند آدمیوں کے اس کی پوری کمپنی کا صفایا ہو گیا مگر دشمن کی کمک میں بدستور اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور پاکستانی مجاہدین کے عزم صمیم سے ٹکرا کر چور چور ہوتا گیا۔ بالآخر وہ اپنے آخری حربے پر اتر آیا اور فضائیہ کو مقابلے میں لے آیا۔ اس کے طیارے فضا سے بمباری کر رہے تھے لیکن پاکستانی فوج کا دبدبہ ان کے ذہنوں پر اس قدر طاری تھا کہ خوف و ہراس کے عالم میں ایک نشانہ بھی ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ مسلسل بمباری سے ایک

گولہ اس مشاہداتی پر آگرا جس پر میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھی دشمن سے نبرد آزما تھے۔ بم گرا اور چوکی کا ایک حصہ تباہ ہو گیا لیکن تمام مجاہدین بال بال بچ گئے۔

مشاہداتی پوسٹ پر بم گرنے کا یہ مطلب تھا کہ دشمن کو اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ یہ جگہ دشمن کی نظروں میں تھی لیکن میجر عزیز بھٹی کے ساتھی وہیں دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ میجر عزیز اس چوکی سے دشمن کی نقل و حرکت کا مظاہرہ کر کے ساتھیوں کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ دشمن نے مسلسل ہزیمت سے اکتا کر ٹینکوں کی مدد سے پیش قدمی شروع کر دی۔ میجر عزیز بھٹی نے آنے والے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے توپ خانے کو ہوشیار ہو جانے اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روکنے کا حکم دے دیا۔ توپ خانے کی مسلسل گولہ باری سے دشمن کو کافی نقصان پہنچا لیکن کمک کی مسلسل سپلائی کی وجہ سے وہ آگے بڑھتا آرہا تھا۔ اس کا راستہ روکنے کے لیے اب ایک ہی طریقہ تھا کہ بی آر بی لنک کا پل توڑ دیا جائے۔ چنانچہ پل توڑ کر راستے کو مسدود کر دیا گیا اور اسے روک دیا گیا۔ اب تک دشمن نے پیش قدمی کی جتنی بھی کوششیں کی تھیں، پاکستانی مجاہدوں نے انہیں بری طرح ناکام بنایا تھا۔ اس مسلسل ہزیمت کی وجہ سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بر کی محاذ پر پاکستان کی بے شمار فوج اور کافی گولہ بارود جمع ہے۔ حالانکہ صرف ڈیڑھ سو مجاہدین اور توپ خانے کا صرف ایک یونٹ میجر عزیز بھٹی کی نگرانی میں صف آرا تھا۔ دشمن اپنے تمام جتن آزما کر عاجز آچکا تھا اور اس کا لاہور پہنچ کر عیاشی کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ میجر عزیز بھٹی اپنے مشن کی اس کامیابی پر بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو گئے۔

7 ستمبر کا سورج طلوع ہوا۔ تو اس نے اپنی سنہری کرنیں مجاہدین کے قدموں میں نچھاور کر دیں۔ ایک نئے عزم اور ولولے سے بیدار ہونے والے یہ مٹھی بھر مجاہدین پہلے سے کہیں تر و تازہ تھے۔ گزشتہ رات گاڑیوں کی آمد و رفت سے میجر عزیز بھٹی یہ جان چکے تھے کہ دشمن رات بھر اسلحہ جمع کرتا رہا ہے۔ دوربین سے جب انہوں نے حالات کا جائزہ لیا تو ان کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ دشمن نے واقعی خود کو کافی مضبوط کر لیا تھا اور اب وہ قیامت بن کر مجاہدین پر ٹوٹنا چاہتا تھا۔ میجر عزیز بھٹی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کا حکم دے دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستانی توپ خانے نے وہ آگ

برسائی کہ دشمن بھسم ہو کر رہ گیا۔ بنئے نے جب اس جانی اور مالی نقصان کو محسوس کیا تو اپنی اس فضائیہ کو جس پر اسے بہت مان تھا، پھر میدان میں لے آیا لیکن پاکستان کے شاہین صفت جوانوں نے اس کا یہ غرور بھی خاک میں ملا دیا اور ایک ایک کر کے تمام طیارے گرا دیئے۔ 7 ستمبر کا یہ دن میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھیوں کی فرض شناسی اور عقیدت کے سامنے عقیدت سے سرخم کر گیا۔ لاہور کو حاصل کرنے کی خواہش میں دشمن نے اس روز بھی اپنے بہت سے جوانوں کو گاجر مولی کی طرح کٹوا دیا۔ اس کی نہر کو پار کرنے کی تمام کوششیں بیکار ہو گئیں۔ ہمارے شیر بہادر اپنی جگہ جمے کھڑے تھے۔

6 ستمبر کے بعد 7 ستمبر کا دن بھی گزر گیا۔ آرام تو ایک طرف میجر عزیز بھٹی نے کھانا پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ دشمن کو پیش قدمی سے روکا جائے۔ وطن عزیز کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنا آرام و سکون سب قربان کر دیا تھا۔ اس مسلسل تگ و دو اور بھوک پیاس کی وجہ سے آپ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو جب علم ہوا کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا تو انہوں نے میجر صاحب سے آرام کرنے اور کھانا کھانے کو کہا لیکن میجر صاحب نہ مانے اور اپنے مقدس فریضہ کی ادائیگی میں دل و جان سے مصروف عمل رہے۔

8 ستمبر کو دشمن نے محاذ کا رخ بدل دیا اور چھنک ونڈی کی طرف سے پوری طاقت سے حملہ کر دیا لیکن یہاں بھی میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں اس کو ذلت و شکست کا سامنا ہوا۔ دشمن ہر آن پینترے بدلتا۔ تازہ دم کمک اور وافر مقدار میں اسلحہ کی سپلائی کے باوجود وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ میجر عزیز بھٹی مسلسل تین روز سے دشمن سے برسرپیکار تھے۔ ان کے ساتھی اور افسر جانتے تھے کہ یہ بے آرامی اور مشقت ٹھیک نہیں، اس لیے ان کے کمانڈنگ آفیسر کرنل قریشی نے انہیں یہ محاذ چھوڑ کر پیچھے آجانے اور آرام کرنے کی ہدایت کی لیکن میجر عزیز بھٹی رضامند نہ ہوئے۔ تین دن سے مسلسل دشمن کے سامنے ڈٹے رہنے سے وہ اس کی چالاکیوں اور محاذ کے تمام رموز و اسرار کو جان چکے تھے جبکہ نئے آنے والے کو حالات پر قابو پانے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت تھی۔ میجر عزیز جانتے تھے کہ دشمن اس وقت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لیے وہ فرنٹ پر رہے اور دشمن کی پسپائی کا موجب بنے۔

دشمن کی معلومات بھی خاصی وسیع تھیں۔ میجر عزیز بھٹی کی مشاہداتی چوکی جو اب تک اس کی ناکامی کا باعث بنی ہوئی تھی، اس کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اسے ہر وقت پر تباہ کر دینا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے 9 ستمبر کو اس کے جہازوں نے زبردست گولہ باری کی لیکن وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ ہاں اس کی جرأت کا اسے پاکستانی مجاہدوں نے خوب خوب سبق سکھا دیا تھا۔ محاذ کے آس پاس دشمن نے اسلحہ کی کافی مقدار اکٹھی کر رکھی تھی جو مجاہدوں کو بروقت پتہ چل جانے پر تباہ کر دی گئی۔ مشاہداتی چوکی دشمن کے لیے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ آخر اس نے توپ سے بمباری کی جس سے مشاہداتی چوکی کا کچھ حصہ اس کی زد میں آ گیا۔ تاہم کوئی نقصان نہ ہوا اور مجاہدین فضل ربی سے محفوظ رہے۔ اچانک دشمن کے حملوں میں کمی آ گئی۔ اس وقت میجر عزیز بھٹی مورچوں کی طرف ساتھیوں کے معائنے کو چل دیئے۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت جانا اور دو ٹینک مشاہداتی چوکی کی طرف روانہ کر دیئے لیکن میجر عزیز بھٹی کو فوراً پتہ چل گیا اور وہ ٹینک ناکارہ بنا دیئے گئے۔

10 ستمبر کو دشمن نے محاذ کا رخ پھر بدل لیا۔ برکی کلاں کی جھاڑیاں اور آس پاس کا علاقہ اس کے اسلحہ سے بھرا پڑا تھا۔ اس کی خبر جب میجر عزیز بھٹی کو ہوئی تو انہوں نے اس اسلحہ کو مجاہدین کے فائروں سے بھسم کرا دیا۔ اپنی اس ناکامی پر دشمن اور سٹپٹایا اور برکی کلاں کو چھوڑ کر برکی خورد کی طرف سے حملہ آور ہوا۔ اس وقت اس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک منظم دستہ اور بھاری توپ خانہ بھی تھا۔ دشمن نے چونکہ اس بار بڑی طاقت اور جوانوں کی کثرت سے حملہ کیا تھا، اس لیے ہمارے مجاہدین کو بھی کسی منظم سکیم کے تحت مقابلے کی ضرورت تھی۔ میجر عزیز بھٹی کی ہدایت پر پاکستانی جوان مورچوں سے نکل کر بچتے بچاتے نہر کے کنارے مورچے سنبھالنے لگے۔ میجر عزیز بھٹی اس مورچہ بندی میں مصروف تھے کہ حالات یکایک سنگین ہو گئے۔ دشمن نے بریگیڈ نے ٹینک بٹالین کی مدد سے حملہ کر دیا۔ میجر عزیز بھٹی نے فوری فائر کا حکم دیا۔ مجاہدین نے آگ کی بارش شروع کر دی۔ بہت سے ٹینک تباہ کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ دشمن کا ٹینک کمانڈر بھی مجاہدین کے ہاتھوں کتے کی موت مارا گیا۔

چونکہ دشمن تعداد میں زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے چاروں طرف سے پھیل کر

مجاہدین کا محاصرہ کر لیا۔ میجر عزیز بھٹی اس وقت اپنی مشاہداتی چوکی میں تھے۔ یہاں سے نکل کر کنارے پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اس غرض سے جب وہ چوکی سے نیچے اترے تو دروازے پر دشمن کا ایک مسلح دستہ کھڑا تھا۔ میجر عزیز بھٹی کو دیکھتے ہی کمانڈر سکھ حوالدار نے ہینڈز اپ کرا دیا اور اپنی سٹین گن کی نالی ان کے ایک ساتھی کے شانے پر رکھ دی۔ صورتحال انتہائی سنگین تھی۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی لیکن میجر عزیز بھٹی قطعی ہراساں نہ ہوئے۔ انتہائی ہوشیاری اور چابک دستی سے پینترا بدلا اور گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ دشمن غالب ہونے کے باوجود اس قدر بوکھلایا کہ نہ صرف میجر عزیز بھٹی خطرے سے نکل آئے بلکہ دشمن کے کئی ساتھی وہاں ڈھیر ہو گئے اور جو بچے وہ وہاں ٹھہر نہ سکے۔ خطرہ ٹلتے ہی میجر عزیز بھٹی اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر نہر کے کنارے اپنے باقی ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

جنگ زوروں پر تھی۔ دشمن رہ رہ کر حملہ آور ہو رہا تھا۔ اسے ہر آن کمک اور اسلحہ سپلائی کیا جا رہا تھا جبکہ مجاہدین کا ایمونیشن قریب الختم تھا۔ دشمن بڑھتا نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ میجر عزیز نے حالات کی نزاکت کا بخوبی احساس کر لیا۔ اپنی توپ کو گرینڈ کے ذریعے ناکارہ بنا دیا تاکہ دشمن کے کام نہ آ سکے۔ اس کے بعد ساتھیوں کو نہر پار کرائی۔ پاک فوج کا ایک جوان نہر کو پار نہ کر سکا اور دوسرے کنارہ پر رہ گیا۔ میجر عزیز بھٹی کو اس ساتھی کے بچھڑ جانے کا بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے پاک فوج کے دو بہترین تیراک بلا کر انہیں اپنے ساتھی کو لانے کی خواہش ظاہر کی لیکن حالات خطرناک دیکھتے ہوئے انہیں یہ ارادہ بدلنا پڑا۔ 11 ستمبر کو دشمن چاروں طرف سے پوزیشن لیے ہوئے تھا اور اپنی طاقت میں مسلسل اضافہ کیے جا رہا تھا۔ اس کی ایک توپ مجاہدین کی صفوں کو بے ترتیب کر رہی تھی۔ میجر عزیز بھٹی نے وائرلیس کے ذریعے فائر کروا کر اس توپ کے پرخچے اڑا دیئے اور اسے سخت مالی اور جانی نقصان پہنچایا۔ جب بھی دشمن کا نقصان ہوتا، وہ چڑ کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتا۔ اب دشمن نہر کے دوسرے کنارے پر تھا اور شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ نہر کے دوسرے کنارے پر میجر عزیز چڑھے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔ دشمن نے فائرنگ میں اضافہ کر دیا۔ اچانک ایک گولہ آ کر لگا اور پاک فوج کا ایک جوان امر ہو گیا۔ میجر عزیز بھٹی نے جب اپنے ساتھی کو شہید

ہوتے دیکھا تو اپنا رومال اس کے چہرے پر ڈال دیا اور منہ ڈھانپ دیا۔ اب میجر عزیز بھٹی کے غم و غصہ کی انتہاء ہو گئی۔ وہ کسی اوٹ میں چھپے بغیر کھلم کھلا نہر کی پٹڑی پر کھڑے دشمن کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے ایک ساتھی نے جب خطرہ محسوس کیا تو انہیں پٹڑی سے نیچے آ جانے کو کہا لیکن میجر عزیز بھٹی نہ مانے۔ دراصل اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا جا سکتا اور اس کا مقابلہ کیا جا سکتا۔ میجر عزیز بھٹی کسی خطرے کی پروا کیے بغیر بے دھڑک دشمن کے سامنے کھڑے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

اب تک میجر عزیز بھٹی کو محاذ پر گئے 120 گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور اس طویل وقت میں انہوں نے پل بھر کے لیے آرام نہ کیا۔ ان کے افسران اس بات کو جانتے تھے کہ آرام ان کے لیے بہت ضروری ہے اور یہ بھی انہیں علم تھا کہ اگر انہیں آرام کرنے کو کہا گیا تو وہ قطعی نہ مانیں گے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہیں کمانڈنگ آفیسر کی میٹنگ کا پیغام دے کر محاذ سے بلوایا گیا۔ میجر صاحب جب اپنے کمانڈنگ آفیسر کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھٹی صاحب کی مثالی قیادت اور عزم و استقلال کو بہت سراہا اور ساتھ ہی آرام کا مشورہ دیا۔ میجر صاحب نے اس ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وطن کو ان کی بہت ضرورت ہے اور اس پاک سرزمین کے لیے وہ اپنا آرام تو کیا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ آپ کے کمانڈنگ آفیسر سے کوئی جواب نہ بن پایا اور میجر عزیز بھٹی محاذ کی طرف لوٹ گئے۔

جب محاذ پر پہنچے تو ایمبولینس کا ڈرائیور ان سے ملنے آیا۔ اس نے شکایت کی کہ سلف خراب ہے اور دھکا لگا کر سٹارٹ کرنا پڑتا ہے۔ میجر عزیز بھٹی نے اسے فوراً ورکشاپ میں لے جا کر درست کرانے کا حکم دیا۔ کچھ دیر تک اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر اُسے گاڑی سے سٹریچر نکالنے کو کہا۔ ڈرائیور نے سٹریچر نکالا تو وہ ہنستے ہوئے اس پر لیٹ گئے۔ ڈرائیور کی حیرت کو دیکھتے ہوئے وہ کھل کر ہنسے اور بولے بہت آرام دہ ہے اس پر خوب نیند آتی ہے۔ کئی دنوں سے مسلسل جاگنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں اور بہت مشکل سے کھلتی تھیں۔ میجر عزیز بھٹی یکایک سٹریچر سے اٹھے اور بولے۔

"آپ کل گیارہ بجے گاڑی لے آئیں ہو سکتا ہے اس کی ضرورت پڑے۔"

ڈرائیور وہاں سے چلا تو گیا لیکن اسے اس بات کی بہت حیرت تھی کہ میجر صاحب نے خاص طور پر گیارہ بجے آنے کو کیوں کہا ہے۔

12 ستمبر کی خونیں صبح طلوع ہوئی تو میجر عزیز بھٹی نے دیکھا کہ دشمن کے ہزار ہا سپاہی برکی سے شمال کی طرف درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے نہر کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ میجر صاحب کو قدرت نے جو قوت فیصلہ عطا فرمائی تھی۔ اس نے کبھی موقع پر میجر صاحب کو ناکام نہیں کیا تھا۔ میجر عزیز بھٹی نے دشمن کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو فائر کھول دیا اور آن کی آن میں انہیں راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اس کامیابی پر انہیں مسرت ہوئی اور ساتھیوں نے ان کے چہرے پر پہلی بار سکون و اطمینان کی پرچھائیاں دیکھیں۔

اس کے بعد نہر کی پٹڑی سے نیچے اتر آئے پانی منگا کر وضو کیا اور بارگاہ ربّ العزت میں سجدہ ریز ہو گئے۔ عبادت سے فارغ ہو کر شیو بنائی، منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں کنگھی کی اور ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ صوبیدار غلام محمد میجر صاحب کے ساتھیوں میں سے تھے اور اکثر ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ صوبیدار صاحب دست شناسی کا علم رکھتے تھے اس لیے ان کی یونٹ کے آدمی اکثر فرصت کے اوقات میں ان سے اپنی قسمت کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے میجر صاحب کے جی میں نجانے کیا آئی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ حوالدار کی طرف بڑھا دیا اور پوچھا کہ ان کی قسمت میں شہادت کا لکھا ہے کہ نہیں۔

صوبیدار نے ہاتھ کی ریکھاؤں کو ایک نظر دیکھا اور شہادت کی تائید کی۔ لیکن وقت کا نہ بتا سکے۔ میجر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ تم نہیں جان سکتے لیکن میں بتاتا ہوں کہ میری شہادت بہت قریب ہے۔ پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو نئی وردی لانے کا حکم دیا۔ اس جواں نے وردی لا کر دی تو کہا کہ چونکہ میجر صاحب کی اپنی وردی مل نہیں رہی تھی اس لیے دوسرے آفیسر نے ان کے لیے اپنی وردی بھیج دی ہے۔ میجر صاحب یہ جان کر مسکرائے اور بولے۔

"وردی اور کفن اپنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

اور اپنی ہی وردی منگوا کر پہنی۔

میجر عزیز بھٹی خدا کے پراسرار بندوں میں سے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو آنے والے وقت کا بہت پہلے اندازہ کر لیتے ہیں۔ قدرت نے بھی شاید انہیں احساس دلا دیا تھا کہ آنے والا وقت ان کی تمناؤں کی تکمیل کا ہے اس لیے وہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔ میجر صاحب کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ 12 ستمبر کی صبح میجر صاحب کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ شفقت آمیز اور محبت سے بھرا تھا۔

میجر صاحب دوبارہ نہر کی پٹڑی پر چڑھ کر دشمن کا جائزہ لینے لگے۔ دشمن نے اب پھر بمباری شروع کر دی تھی۔ ایک گولہ میجر صاحب کے بالکل قریب آ کر پھٹا لیکن وہ محفوظ رہے۔ اب گولے ان کے قریب اردگرد پھٹ رہے تھے اور عزیز بھٹی خطروں کی پرواہ کیے بغیر کسی حسین جذبے سے سرشار دشمن کی پوزیشن کا پتہ چلا کر اسے جہنم واصل کر رہے تھے۔ میجر صاحب کے حوالدار نے جب دیکھا کہ دشمن کی فائرنگ زوروں پر ہے اور میجر صاحب ان کی زد میں ہیں تو اس نے پٹڑی سے نیچے آ جانے کی درخواست کی۔ لیکن میجر صاحب زمانے اور اس خیال سے کہ ساتھی کی دل شکنی نہ ہو۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور صورت حال پر قابو پا لینے کا یقین دلایا۔

دشمن بھی آج کسی فیصلے کے موڈ میں تھا اور اپنا سارا زور اس محاذ کی طرف لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ٹینکوں کو نہر کی طرف بڑھانا شروع کر دیا اس کے انفنٹری فوج (پیدل فوج) بھی تھی۔ میجر عزیز بھٹی کے حکم سے فائر ہوا۔ اور دشمن کے دو ٹینک تباہ ہو گئے۔ عین اسی موقع پر جبکہ عزیز بھٹی اپنے ساتھیوں کو فائرنگ کا حکم دے رہے تھے کہ ایک گولہ شیشم کے درخت کو کاٹتا ہوا میجر صاحب کے مورچے کے پاس اینٹوں کے ڈھیر پر آ گرا۔ میجر صاحب کے ساتھی بھاگتے ہوئے آئے لیکن میجر صاحب نے انہیں واپس جا کر پوزیشن لینے کی ہدایت کی اور اپنی سلامتی کا یقین دلایا۔

میجر عزیز بھٹی اپنے مشن میں مصروف تھے کہ قرب الٰہی کا وقت آ پہنچا۔ قدرت نے زمین کے باسیوں میں سے اپنے پسندیدہ بندے کا چناؤ کر لیا تھا۔ میجر عزیز بھٹی نہر کی پٹڑی پر چڑھے دوربین سے دشمن کی پوزیشن کا پتہ چلا رہے تھے کہ ایک گولہ ان کا سینہ چیرتے ہوئے دائیں پھیپھڑے سے پار ہو گیا۔ عزیز بھٹی منہ کے بل گر گئے۔

ان کے ساتھی بھاگتے ہوئے آئے۔ لیکن عزیز بھٹی ان سے بہت دور جا چکے تھے۔

میجر عزیز بھٹی کی اس شہادت نے ساتھیوں کو جرأت، دلیری اور جوانمردی جیسے جذبات سے مالا مال کر دیا۔ پاک فوج کے اس بے مثال آفیسر نے کھلم کھلا دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر وطن کی طرف آنے والی موت کا مقابلہ کیا تھا۔ میجر صاحب کی اس شہادت کو تاریخ کے صفحات کا حسن بنا دیا گیا تو یہ صفحات سب پر بھاری تھے۔

میجر عزیز بھٹی کی نعش کو ان کے آبائی گاؤں لادیاں میں لے جا کر فوجی اعزاز سے سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی اس بے مثال قیادت اور عدیم المثالی شہادت کے صلے میں سابق صدر ایوب خاں نے ان کے لیے "نشانِ حیدر" کے اعزاز کا اعلان کیا۔

تاثرات

میجر بھٹی وطن جاں سپاری اور فرض شناسی کے پیکر تھے۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی اپنی جان کی سلامتی یا آرام کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کی قیادت بڑی شجاعت سے پوری اہلیت کے ساتھ ذاتی مثال پیش کر کے کی۔ ان کا یہ جذبہ اور بہادری کا اعلیٰ کارنامہ آرمی کے خون کو ہمیشہ گرم رکھے گا۔

جس وقت عزیز بھٹی شہید کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں لادیاں پہنچایا گیا تو اک کہرام سا مچ گیا۔ عورتوں نے بین شروع کیے تو میجر شہید کی ماں نے انہیں چپ کرا دیا اور دعا کے لیے کہا۔ بڑے سکون سے انہوں نے اپنے لخت جگر کی نعش کو دیکھا اور ہلتے ہوئے لبوں نے صرف اتنا کہا:

"راجہ شہید ہو گیا ہے۔"

میجر عزیز بھٹی شہید اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر و انبساط کے ملے جلے جذبات سے کہا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مرے تو کسی اچھے اور نیک مقصد کے لیے، میں خوش ہوں کہ میرے بیٹے نے حق کی خاطر جان دی۔ ہمیں فخر ہے کہ اس نے آخر دم تک فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ خداتعالیٰ نے بھی اسے شہادت کا مقام

بلند عطا کیا ہے۔ ہمارے سارے خاندان نے اس کے سچے جذبے سے اس خبر کو سنا ہے۔"

میجر صاحب کے والد محترم نے شہید بھٹی کو 1950ء میں ملنے والے اعزاز کے بارے میں بتایا۔

"آپ جانتے ہیں اس پر کیا لفظ لکھے تھے؟ اس پر لکھا تھا:

"حیات جاوداں اندر ستیز است" (ہمیشہ کی زندگی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے) ہم حق پر ہیں اور اس کے لیے ہم بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں ___ عزیز صحیح معنوں میں راجہ تھا۔ وہ بڑا وسیع القلب تھا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔"

میجر عزیز بھٹی کی سوگوار بیوہ زرینہ عزیز نے ان کی شہادت پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"مجھے اپنے جانباز شوہر پر ناز ہے انہوں نے ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جان دی اور شہادت کا رتبہ پایا۔"

زرینہ بیگم نے 23 مارچ کو سابق صدر ایوب خاں سے اپنے شہید شوہر کا اعزاز "نشان حیدر" وصول کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان سے ایک انٹرویو میں اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

"آج یوم پاکستان ہے یہ وہ دن ہے جب ہم نے اپنے ملک کی بنیاد قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس ایثار کا ثبوت دیا وہ نہ صرف میرے لیے باعث فخر ہے بلکہ اس پر پوری قوم فخر کرتی ہے۔ آنے والی نسلوں کے لیے بھی یہ بہت بڑی مثال میرے شوہر نے قائم کی ہے۔ اللہ نے ان کو جنت میں مقام دیا ہے اور مجھے اس نے جس حال مین رکھا ہے اس پر میں شاکر ہوں۔ حکومت نے اور قوم نے میرے شوہر میجر عزیز بھٹی کو نشان حیدر کا اعزاز دے کر اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اللہ ہمارے پاکستان کو مضبوط بنائے اور ہر بلا سے بچائے (آمین)

سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے میجر عزیز بھٹی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

"کسی دوسرے ملک کے سپاہی ہمارے سپاہیوں کی صلاحیتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان پر پوری قوم کو ناز ہے۔ ہماری مسلح افواج نے شجاعت کے ایک نئے دور کی طرح ڈالی ہے انہوں نے اپنے خون سے ملک کی بنیادیں مضبوط کی ہیں اور اب یہ ملک انشاء اللہ ابدالآباد تک قائم رہے گا۔"

پاکستان آرمی کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ نے 6 اکتوبر کو ایک تقریب میں پاکستان کے جیالوں کو اعزازات دینے کے بعد میجر عزیز بھٹی شہید کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے وطن کو دشمن کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے جام شہادت نوش کر کے جس لاثانی شجاعت اور غیر قانونی عزم کا مظاہرہ کیا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور نہ کبھی ہم میجر بھٹی اور ان بہادر افسروں اور جوانوں کو بھول سکتے تھے جنہوں نے اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی ہے پوری قوم ان بہادروں کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں شہیدوں کے درجات کی بلندی کے لیے دست بدعا ہے۔"

لیفٹیننٹ جنرل اعظم خاں جو میجر عزیز بھٹی کے افسران بالا میں سے تھے ان کا کہنا ہے:

"عزیز بھٹی ایک پاکیزہ، نیک سیرت اور بے حد فرض شناس افسر تھے۔ فوج کو ان پر فخر ہے۔"

میجر شفقت بلوچ کافی دیر تک عزیز بھٹی کے ہمراہ رہے ہیں، عزیز بھٹی کی فیاضیوں کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

"وہ سب کے بہترین دوست تھے، زندگی کے ہر مسئلہ میں ان کے مخلصانہ مشوروں کے علاوہ ہر وقت وہ مالی امداد کے لیے کمر بستہ رہتے تھے وہ دوستوں کے لیے "ساہوکار" تھے۔ مدد کی کیسی نوعیت کیوں نہ ہوتی عزیز بھٹی کسی کو مایوس نہ کرتے۔"

میجر یوسف علی شہید کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ عزیز بھٹی کی یاد میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"ان کی دیانت، فرائض منصبی کی انجام دہی میں ان کا انہماک اور قوتِ اعتماد

ان کی ایسی خصوصیات تھیں جو خاص طور پر نمایاں تھیں۔ ایک مرتبہ ایک مذاکرہ (فوجوں کے بغیر تدبیراتی مشق) کے دوران بھٹی کی رائے ہمارے چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل فضل مقیم (جو اب میجر جنرل ہیں) سے مختلف تھی۔ اس مسئلہ پر دونوں کے مابین بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار چیف انسٹرکٹر نے حسب معمول خوش مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے راجہ عزیز، اگر میں کبھی بٹالین کمانڈر کی حیثیت سے آپ کے ایریا میں داخل ہوں اور آپ سے کہوں کہ جیسا میں کہتا ہوں ویسا آپ کریں تو اس وقت آپ کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے مجھ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمہیں اپنے کام کا خیال رکھنا چاہیے اور دخل در معقولات سے احتراز کرنا چاہیے۔ آپ کی زبان سے ان الفاظ کو سننے کے بعد میں چلا جاؤں گا۔" بحث و مباحثہ کے دوران دونوں کے مابین اس امر پر اتفاق رائے ہوگیا کہ چونکہ تدبیراتی مسئلہ کے حل ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اختلاف رائے کا ہر وقت امکان ہے۔ بھٹی اپنے فرائض کو نہایت ہی قابلیت اور باوقار طریقہ سے انجام دیا کرتے تھے۔ وہ کسی کے خلاف تعصب نہ رکھتے تھے اور نہ وہ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ ناجائز طور پر رعایت ہی روا رکھتے تھے۔
کیمپوں اور مشقوں کے دوران وہ ہمیشہ اپنے حصہ سے زیادہ کام کرنے پر تیار رہتے تھے۔ تربیتی مشق "قیادت" کے موقع پر ہمیں ایک ہفتہ کے اندر اسی میل سے زیادہ کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ سونے اور آرام کرنے کا موقع بھی بہت کم ملتا تھا مگر اس کے باوجود عزیز بھٹی ہمیشہ چاق و چوبند رہتے تھے۔ اور یہی نہیں بلکہ خندقیں کھودنے، سنتری کا کام کرنے اور کھانا پکانے کے لیے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مشین گنیں اور وائرلیس سیٹ اٹھا کر لے چلنے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ چونکہ ان چیزوں کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں اٹھا کر چلنا آسان نہیں، مگر ان کا بوجھ عزیز بھٹی کے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

راجہ عزیز بھٹی زندگی کے ہر دور میں ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ دوئم حیثیت ان کے لیے مقدر نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بے پایاں فضل و کرم سے انہیں بجا طور پر شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ جو ایک مسلمان کے لیے سب سے اعلیٰ مقام اور نجات اخروی کا ضامن ہے۔ راجہ عزیز بھٹی کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی مقام بلند پر

فائز کیا اور وطن نے بھی انہیں سب سے اعلیٰ صلہ "نشان حیدر" نذر کیا۔

میجر عزیز بھٹی کے اردلی لانس نائیک قطب، جو جنگ میں ان کے ہمراہ تھے اور ان کی شہادت سے افسردہ اور اداس تھے شہید کے بارے میں بتاتے ہیں:

"کئی روز تک انہوں نے چائے کی پیالی تک نہ پی۔ لیکن انہیں یہ فکر ضرور رہتی تھی کہ اُن کے جوانوں کو گرم گرم کھانے ضرور مل جائیں۔ میں نو برس کی عمر سے ان کی خدمت میں ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے فوج میں بھرتی کرایا۔ وہ میرے لیے ایک افسر سے بھی زیادہ تھے۔ وہ میرے صاحب، میرے محسن اور میرے دوست تھے۔"

چوتھا نشانِ حیدر

راشد منہاس شہید

ایئر فورس کے ایک آفیسر اپنے عزیزوں سے ملنے گئے تو یونیفارم میں ملبوس تھے میزبانوں کا کمسن بچہ بڑے غور سے مہمان کو دیکھے جارہا تھا نجانے اسے مہمان میں کیا کشش دکھائی دی کہ وہ مبہوت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مہمان کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی ٹوپی میز پر اتار کر رکھ گیا۔ ننھے میاں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جھٹ وہ ٹوپی پہن کر کرسی پر افسرانہ ٹھاٹ سے اکڑوں بیٹھ گئے۔ اس وقت اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی کی ایسی خوشی تھی جیسے اس کی کسی بہت بڑی خواہش کی تکمیل ہوئی ہو۔

یہی بچہ ایک دن بیمار ہو گیا اور اسے کمبائنڈ ملٹری ہاسپٹل میں داخل کروا دیا گیا۔ اتفاق سے ملک کے صدر بھی اسی ہاسپٹل میں فراش تھے اور ان کی عیادت کے لیے بڑے بڑے آفیسرز آرہے تھے۔ ایک دن فضائیہ کے سربراہ صدر مملکت کی عیادت کو آئے تو یہ خبر اس بیمار بچے تک پہنچ گئی۔ بس کیا تھا وہ بچہ مچل اٹھا کہ پاک فضائیہ کے سربراہ کو ضرور دیکھے گا۔ اس کے بڑے بھائی اسے گود میں اٹھا کر لے گئے اور جب وہ پاک فضائیہ کے سربراہ کو دیکھ کر لوٹا تو پھولا نہیں سما رہا تھا اور ایک دن خود ایئر مارشل بننے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

یہ ننھا بچہ جس کی خواہشات اتنی عجیب و غریب تھیں وہی راشد منہاس تھا جو [illegible] کے ناموس و تحفظ پر دیوانہ وار نثار ہو گیا اور مطیع الرحمن



پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید نشانِ حیدر

غدار کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا کر ایثار و قربانی اور عظمت و عزیمت کی نئی تاریخ مرتب کر گیا۔ یہ ملک کے چوتھے اور سب سے کم عمر ہیرو ہیں۔ جنہیں پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشان حیدر" ملا اور جنہوں نے خالد و طارق اور محمود قاسم کی یاد پھر سے تازہ کر دی۔

خاندان

راشد منہاس کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے لوگ اپنے وعدے اور بہادری کی بنا پر ہمیشہ اچھے لفظوں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ابتداء میں یہ خاندان جموں و کشمیر میں آباد ہوا اور یہیں مشرف بہ اسلام ہوا۔ چار گاؤں کی ملکیت کے ساتھ یہ خاندان سینکڑوں ایکڑ زرعی اراضی کا مالک تھا۔ لیکن توحید پر ایمان لاتے ہی اپنے علاقے کے ہندوؤں کی بربریت اور دہشت کا شکار ہو گیا۔ اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح اس خاندان کے افراد مئے توحید کے نشے میں اپنا سب کچھ لٹا کر گورداس پور ہجرت کر آئے۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں قلعہ سوبھا سنگھ کے نواح میں مقیم ہو گئے۔

راشد کے دادا عبداللہ منہاس پابند صوم و صلوٰۃ اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ قدرت نے انہیں معرفت الٰہی سے بڑی فیاضی سے نوازا تھا وہ عاشق رسولؐ تھے اور اس عشق کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے تھے۔ اپنے اعمال و فعال کی بدولت اور اپنے پاکیزہ خیالات و نیکوکاری کی وجہ سے وہ معزز و محترم تھے۔ غریب پروری اور ہمدردی کی بنا پر نہایت ہردلعزیز تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

راشد منہاس کی دادی ایک تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار اور نیک دل خاتون ہیں چالیس سال تک وہ تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں۔ فارسی زبان پر انہیں کافی عبور حاصل ہے اور فارسی کے عظیم شعراء کا کلام انہیں ازبر ہے۔ ان کی اسی تعلیم دوستی کی بدولت ان کی اولاد زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوئی۔ قدرت نے انہیں نو صاحبزادے عطا کیے جو سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں اور جن میں راشد کے والد سب سے آگے ہیں۔ راشد کے دادا عبداللہ نے سیالکوٹ میں بک بائینڈنگ کا کام شروع کیا تھا

اور اپنی روایتی ایمانداری اور نیک نیتی کی وجہ سے خوب ترقی کی تھی۔ رزق حلال سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں زمانے نے وہ اوصاف ان کی اولاد میں دیکھے۔ ان کے نو بیٹے ہیں اور سب کے سب نیک اور باکمال ہیں۔

راشد کے والد نے میٹرک کا امتحان نمایاں پوزیشن لے کر پسرور سے پاس کیا تھا۔ بعد ازاں مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے اور انٹر پاس کیا پھر لاہور چلے آئے اور یہاں اسلامیہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ راشد کے تایا عبداللطیف منہاس بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ پہلے وہ قانون گو تھے اور اس عہدے سے ریٹائر ہو جانے کے بعد ان دنوں ملتان میں زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لطیف منہاس ساری عمر محکمہ تعلیم میں رہے ہیں اور ہیڈ ماسٹر رہے ہیں۔ اس کے بعد عبداللہ منہاس کے چوتھے صاحبزادے یعنی ارشد کے والد مجید منہاس بری فوج میں گیریژن انجینئر رہ چکے ہیں اور آج کل کراچی میں ٹھیکیداری کرتے ہیں۔

مجید منہاس بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ ملٹری میں انجینئرنگ سروس میں تھے اور اپنے بے مثال کارناموں کی وجہ سے انڈیا میڈل، برما میڈل اور عراق میڈل وصول کر چکے ہیں۔ وہ مشرق وسطیٰ کے علاوہ کئی اور بیرونی ممالک میں رہ چکے ہیں۔ خاصے صاحب حیثیت آدمی ہیں ان کی ساری زندگی جہد مسلسل کا صحیح نمونہ ہے۔ نوکر ہونے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی کفالت کی اور انہیں ذاتی توجہ سے تعلیم دلوائی۔ مجید منہاس کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز منہاس ریلوے کیرج شاپ مغلپورہ میں سنیئر چارج مین ہیں۔ ان سے چھوٹے عبدالحکیم منہاس ان دنوں امریکہ میں انجینئر ہیں اور انجینئرنگ کی دنیا میں کافی شہرت کے حامل ہیں۔ راشد کے دوسرے چچا عظیم منہاس بھی امریکہ میں ہیں جہاں ان کے پاس راشد کے دو بھائی خالد مجید اور ارشد مجید بھی زیر تربیت ہیں۔

راشد کے خاندان کے دوسرے کئی افراد بھی کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ راشد منہاس کی سب سے بڑی بہن فریدہ منہاس کی شادی 1966ء میں میجر نصیر احمد کے ساتھ ہوئی میجر نصیر احمد پاک فوج کے ایک جیالے اور فرض شناس افسر ہیں اور 65ء کی جنگ کے دوران ستارہ جرات کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں ان کے بھائی بریگیڈیئر

عبدالرحمٰن کو بھی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ستارہ پاکستان کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ راشد کے خالہ زاد بھائی سعید چغتائی 1948ء میں کشمیر کی جنگ میں شریک ہو چکے ہیں اور کیپٹن رہ چکے ہیں۔ راشد کے سبھی بہن بھائی مختلف کالجوں میں زیر تعلیم ہیں۔

حالات زندگی

راشد منہاس شہید 17 فروری 1951ء کو رات نو بجے کے قریب کراچی میں فضائیہ کے ہسپتال میں پیدا ہوئے گویا زندگی کی ابتدا ہی سے فضائیہ سے ایک تعلق تھا۔ بہت دبلے پتلے لیکن چست اور پھرتیلے تھے جہاز ان کی پسندیدہ چیز تھا۔ جب بھی اسے دیکھتے خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔ کھلونوں میں سے بھی ان کی پسند جہاز ہوتا کتابوں، رسالوں یا جہاز کی تصویر دیکھتے تو اسے کاٹ لیتے اور کمرے کی دیواروں یا میز پر بہت سلیقے سے سجانے لگتے۔ کم سنی ہی سے وہ ذہنی طور پر اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے منفرد تھے اور بہت چھوٹی عمر ہی میں ان کی ذہانت نے دوسروں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر ہی سے کیا۔ اس سلسلہ میں ان کے تایا عبدالرشید منہاس کا بہت ہاتھ تھا۔ بچپن ہی سے انہوں نے راشد کے دل میں مذہب کی محبت کا جو بیج بویا تھا وہ ساری عمر پھلتا پھولتا رہا۔ تایا کے ساتھ ساتھ ان کے والد عبدالمجید منہاس نے بھی کافی توجہ دی اور قابل احترام ماں درس گاہ اول ثابت ہوئیں۔ جنہوں نے اپنے اوصاف حمیدہ سے راشد کو ملک و قوم کے لیے انمول ہیرا بنا دیا۔ راشد نے ابتدائی تعلیم میں اپنی والدہ سے بہت کچھ سیکھا۔ تاہم جب پانچ سال کے ہوئے تو انہیں سکول بھیج دیا گیا۔ اس وقت ان کے والد کا لاہور میں قیام تھا۔ چنانچہ کوئین میری اور جیس سکول لاہور راشد کی ابتدائی درسگاہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے والد کو راولپنڈی رہنا پڑا اور یوں راشد کو سینٹ میری اکیڈمی رائل آرٹلری بازار راولپنڈی میں داخل کر دیا گیا اور جب یہاں سے ان کے والد نے کراچی سکونت اختیار کی تو سینٹ پیٹرک کالج میں راشد نے داخلہ لے لیا اور یہیں سے سینئر کیمبرج کا امتحان نمایاں پوزیشن سے کر پاس کیا۔ سینئر کیمبرج کے امتحان کے بعد ابھی نتیجہ کا انتظار تھا کہ انہوں نے ائیر فورس کے لیے اپلائی کر دیا۔ راشد کے والد کی خواہش تھی کہ وہ ان کی طرح انجینئر بنیں لیکن انہوں نے والد سے چوری ائیر فورس کے لیے انٹرویو دے دیا۔ یہاں بھی ان کے والد نے انہیں انجینئر بنانے پر بہت اصرار کیا لیکن راشد اپنی ضد پر اڑے رہے اور اس کے ساتھ انہوں نے اپنی والدہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا یوں ان کے والد نے انہیں فوج میں جانے کی اجازت دے دی۔ اپنے والد کی اجازت پاتے ہی راشد منہاس 1968ء میں پاک فضائیہ میں شامل ہو گئے اور تربیت کے لیے کوہاٹ چلے گئے۔ کوہاٹ میں دوران تربیت ان کی غیر معمولی ذہانت، کام سے لگن اور آگے بڑھنے کے جذبے نے ان کے اساتذہ کو بہت متاثر کیا اور وہ جلد ہی سب کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ ان کی بہترین کارکردگی کی بنا پر اعلیٰ تربیت کے لیے انہیں رسالپور بھیجا گیا۔ یہاں پاکستان ائیر فورس اکیڈمی سے فلائٹ کیڈٹ کی ٹریننگ حاصل کی نیز جوڈو اور سیلف ڈیفنس کا کورس بڑی شان سے پاس کیا۔ ائیر فورس اکیڈمی کے طالب علم کی حیثیت سے جون 1970ء میں پشاور یونیورسٹی سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی اس کے علاوہ سائنس، الیکٹرونکس علم موسمیات، اور پرواز سے متعلقہ تمام علوم کا مطالعہ کیا اور ان کے امتحانات 1971ء تک پاس کر لیے۔ اب وہ پاکستان ائیر فورس اکیڈمی رسالپور کے فارغ التحصیل کیڈٹ تھے اور 15 اگست 1971ء کو ان کی تعلیم مکمل ہو گئی اور وہ پائلٹ آفیسر بن گئے۔

بچپن ـــ عادات و خصائل

راشد منہاس بچپن ہی سے غیر معمولی ذہین تھا جب کبھی ان کے ماموں ونگ کمانڈر سعید ان کے ہاں آتے تو وہ ان کی ٹوپی پہن لیتے اور خوشی سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ جب ان کی عمر پانچ برس کی تھی وہ ایک درخت کے ساتھ جھولا ڈال کر جھولنے لگے۔ ان کے چچا عبدالعزیز منہاس جن سے انہیں بہت پیار تھا وہ پاس کھڑے تھے۔ راشد منہاس جھولے پر پیٹ کے بل لیٹ گئے اور بازو پھیلا کر زور زور سے کہنے لگے دیکھو چچا میں ہوائی جہاز بن گیا ہوں۔ اسی طرح ایک بار وہ اپنے تایا کے ساتھ شالیمار گارڈن کی سیر کو گئے۔ ایک کھلونوں کی دکان پر کھلونے خریدنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی نظر انتخاب پستول پر پڑی اور اپنے چچا سے کہہ کر اسے ہی خریدا۔

یہ دو معمولی سے واقعات ہیں لیکن ان کے ذہنی رجحان کے غماز ہیں۔ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ہی فوجی تھے اور عسکری خیالات قدرت نے انہیں نہایت کم سنی سے ہی ودیعت فرمائے تھے۔ بچپن ہی سے جہازوں کے ماڈل اور ان کی مشینری سے انہیں غایت درجہ دلچسپی تھی۔ اکثر اپنے خالوزاد بھائی سے جہازوں کے بارے میں باتیں کرتے اور ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے جب بھی اپنے لیے کھلونوں کا انتخاب کیا ہمیشہ جہاز ان کو پسند آیا۔

راشد بچپن ہی سے بہت حاضر جواب اور قدرے شریر اور ظریفانہ طبیعت کے حامل تھے۔ایک بار وہ اپنے کتے کے ساتھ کھیل رہے تھے ان کے والد مجید منہاس نے جب انہیں دیکھا تو منع کیا اور بتایا کہ کتے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے کیونکہ نجس اور پلید ہوتا ہے۔ چند روز گزر گئے۔ ایک روز راشد کے ابا نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ پیچھے باندھے کتے سے کھیل رہے ہیں۔ ان کے والد کو اس منظر پر بڑی حیرت ہوئی۔ ابھی وہ دریافت کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ راشد نے معصومیت سے کہا۔

"میں کتے کو ہاتھ نہیں لگا رہا۔ اب تو میرے ہاتھ پلید نہیں ہوں گے۔"

راشد بہت چھوٹی عمر ہی میں شرم و حیا اور غیرت و حمیت کا مجسمہ تھے۔ بچپن کا ایک واقعہ اس کے ثبوت کے طور پر درج ہے۔

ایک بار ان کی آیا انہیں نہلانے کے لیے لے گئیں۔ دوسرے کپڑوں کے ساتھ جب وہ نیکر اتارنے لگیں تو راشد نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور اپنے ابا سے شکایت کی کہ آیا انہیں ننگا کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ آیا سے بازو چھڑا کر خود غسل خانے میں گئے اور دروازہ بند کر کے نہائے۔

اس کے باوجود کہ راشد نے اپنی تعلیم کا آغاز انگریزی طرز کے سکولوں سے کیا اور ماحول کے زیر اثر انہیں مذہب سے برگشتہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ بلکہ ان عادات و خصائل میں ذرا بھر تبدیلی نہ آئی اور ایمان کی جو دولت انہیں گھر کے ماحول سے نصیب ہوئی تھی اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دین اور احکامات دین سے انہیں خاصی سوجھ بوجھ تھی اور وہ صحیح معنوں میں ایک مرد مومن تھے اور یہ قدرت کا

ایک قابل ذکر معجزہ اور راشد منہاس کی استقامت ہے کہ یورپی ماحول کے تعلیمی اداروں میں جانے کے باوجود ان کی طبیعت نے گمراہی اور بے راہروی کے رجحانات کو نہ اپنایا اور وہ اقبال کے شاہین صف جاں بازوں میں شمار ہوئے اور فلسفہ اقبال کے شاہین کا عملی نمونہ بن کر قوم کے سامنے آئے۔

راشد منہاس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور کشش تھی۔ میجر عزیز بھٹی کی طرح ان کی آنکھوں میں بھی ایک گہرائی تھی۔ جس کے اندر پوری قوم سما کر رہ گئی۔ ایسی آنکھیں دشمن کی مکارانہ چالوں کو بھانپ کر انہیں ناکام بنا دیتی ہیں۔ وہ بہت سادہ انسان تھے اور کبھی اپنے اصولوں کے خلاف کوئی بات نہ کرتے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کے لیے وقف کر دیں۔ وہ عظیم انسانوں کے اقوال و افکار اور سوانح عمریاں پڑھتے اور اچھی اچھی باتیں یادداشت کے طور پر لکھ لیتے۔ اسی مقصد کے لیے انہیں ڈائری لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس وقت انہوں نے ڈائری لکھنی شروع کی اس وقت ان کی عمر چودہ سال کی تھی۔ اس چھوٹی عمر ہی میں ان کی سوچ کا انداز نرالا تھا۔

مثلاً ایک جگہ وہ زندگی کی بے ثباتی کو زیر بحث لاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"انسان فانی ہے اور موت برحق ہے اسے ایک نہ ایک روز ضرور آنا ہے کوئی شخص ابد تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی مختصر زندگی میں کوئی اچھا کارنامہ سرانجام دے اور اگر ممکن ہو تو عمر ملک و ملت کی خدمت میں گزار کر نیک نامی حاصل کرے۔"

یوں تو ڈائری کا ہر ورق اپنے سینے پر ان کہی داستان سجائے ہوئے ہے لیکن کچھ اوراق ایسے ہیں جو راشد کی عالی ظرفی اور فہم و ادراک کی انتہائی بلندیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں سب سے پہلے قائد اعظم کا یہ قول لکھا ہے۔

"UNITY—FAITH—DECIPLINE"

(ایمان۔اتحاد۔تنظیم)

اس کے بعد انہوں نے امریکی صدر ابراہیم لنکن کا یہ مقولہ درج کیا ہے جس میں انہوں نے جمہوریت کے بارے میں بتایا تھا کہ عوام کی حکومت، عوام کے لیے،

عوام کے ذریعے

"DEMOCRACY BY THE PEOPELE, FOR THE PEOPLE, OF THE PEOPLE,"

سابق صدر ایوب کی تقریر کے اس جملے سے بہت متاثر تھے اور اسے ڈائری میں لکھا تھا۔

"GO MEET THE ENEMY"

(آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو)

ہٹلر کا قول جس میں اس نے فتح یا موت کا کہا ہے۔ ان کو خاص پسند تھا:

"VICTORY OR DEATH"

پیٹرک ہنری کا یہ قول

"SIR GIVE ME LIBERTY OR DEATH"

(مجھے آزادی دیجئے یا موت)

بھی ان کی سوچ کے انداز کو واضح کرتا ہے۔

راشد کی ڈائری کے یہ اوراق اس کے قلب و ذہن کی سوچ کو واضح کرتے ہیں کہ وہ کس جمہوری طرز حکومت کا حامی تھا اور اس کی نظروں میں آزادی کی کتنی قدر و قیمت تھی۔

راشد بچپن ہی سے حد درجہ حساس، کشادہ دل اور عالی ظرف انسان تھا۔ ان کے والد عبدالمجید منہاس اکثر دوسروں کی مالی اعانت فرمایا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک بیوہ ان سے وظیفہ وصول کیا کرتی تھی۔ ایک بار اس کا لڑکا جب وہ رقم لینے کے لیے آیا تو اس کی مڈ بھیڑ راشد سے ہو گئی۔ راشد نے بڑے تپاک سے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اپنی والدہ سے کہنے لگا۔

"امی ایک لڑکا اپنا حصہ لینے آیا ہے اسے جلد فارغ کر دیں۔"

مندرجہ بالا مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا کتنا پاسدار تھا۔

اور دوسروں کی خودداری کی کتنی تعظیم کرتا تھا اس نے خیرات یا امداد کی

بجائے "حصہ" کا لفظ محض اس لیے استعمال کیا کہ انسانیت کی توہین نہ ہو۔

راشد بچپن ہی سے بہت غیور اور خوددار تھے۔ وہ انسانوں کے درمیان کسی درجہ بندی کے قائل نہ تھے۔ اور باہمی اخوت و مساوات کے حامی تھے۔ دوسروں کے جذبات کا انہیں پاس تھا۔ وہ چھوٹے تھے لیکن ان کی عادتوں میں بڑا پن تھا اور ان کی انہی عادات کی وجہ سے خاندان کے لوگ انہیں "راشد صاحب" کہہ کر پکارتے تھے عید کے موقع پر وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو عیدی دینا نہ بھولتے۔

ان کے چچا کا کہنا ہے کہ ایک بار وہ ان کے گھر گئے اور راشد اور اس کے دوسرے بہن بھائیوں کے لیے ٹافیاں وغیرہ لے گئے۔ راشد نے ٹافیاں لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں سے ایسا تکلف نہیں کرایا کرتے۔

راشد منہاس ایک بیباک مقرر بھی تھے اور اپنی بات واضح کرنے کے لیے ان کے پاس الفاظ و معانی کا ایک ذخیرہ تھا۔ پی اے ایف اکیڈمی کے کئی مباحثے ان کی یادگار تقریروں کے گواہ ہیں۔ وہ اپنے ٹھوس دلائل سے سامعین کو قائل کرنے کا گر جانتے تھے۔ علاوہ ازیں فوٹوگرافی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی کے شائق اور تیراکی کے دیوانے تھے۔

مہم جو اور جرنیل قسم کے انسان راشد کے ہیرو تھے وہ ایسا لٹریچر بہت پسند کرتے جو جنگ سے متعلق ہوتا اور اس موضوع پر بننے والی فلمیں انہیں بہت پسند آتیں۔ ان کی مختصر سی لائبریری میں جو کتابیں تھیں ان میں سے اکثر کے سرورق پر جہازوں اور ٹینکوں وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئیں ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسے شروع ہی سے عسکری زندگی سے لگاؤ تھا۔ ان کے خاص کمرے میں افواج پاکستان کے جانبازوں اور بہادروں کی تصاویر آویزاں ہیں جو انہوں نے مختلف کیلنڈروں اور رسالوں سے حاصل کی ہیں۔ ایک تصویر میں پاکستان کا شاہباز ہاتھ میں کیپ پکڑے اپنے طیارے کے قریب شان تفاخر سے کھڑا ہے۔ اس تصویر کے نیچے راشد نے لکھا ہے۔

"دشمن اس جوان سے بہت ڈرتا ہے کیونکہ اس نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں اس کی خوب پٹائی کی۔"

اسی قسم کے بعض اور مختصر مگر پر معنی جملے ان کی فکری رسائی کے ترجمان ہیں۔ افواج پاکستان کی تصویر کے نیچے "شہنشاہ جنگ ــــ ہماری آرٹلری فوج" اور "ملکہ جنگ" جیسے ریمارکس یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے دل میں افواج پاکستان کے جوانوں کی کتنی قدر تھی اور وہ ان سے کس قدر متاثر تھے۔

راشد کے بہنوئی میجر نصیر احمد ستارۂ جرأت راشد کے بارے میں کہتے ہیں۔

"اسے بڑے بڑے لوگوں اور مشاہیر اسلام کے قصے پڑھنے کا جنون تھا۔ اس نے اقبال، عمر خیام اور دوسرے مفکرین کا مطالعہ کیا تھا اور وہ ہمیشہ حیات جاوداں کا خواہش مند رہا تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں اس نے ہٹلر، میک آرتھر، رومیل اور ڈگلس جیسے لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھے تھے۔ کتابیں اس کا شوق تھیں اور اسے جتنے بھی پیسے ملتے وہ ان کی کتابیں خرید لیتا تھا۔ اس کی پڑھی ہوئی کتابوں میں بعض حصوں پر نشان لگے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان حصوں سے بہت متاثر ہوا ہے اس کی سوچ کی پرواز بہت بلند تھی اس نے ہمیشہ اچھا سوچا تھا اور اچھی باتوں کو پسند کیا تھا۔ خود میری یہ عادت ہے کہ میں نے عام بچوں کو کبھی منہ نہیں لگایا لیکن نجانے راشد میں کیا بات تھی کہ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے لطف محسوس ہوتا۔ وہ بہت چھوٹی عمر ہی سے بہت ذہین تھا اس کی معلومات قابل رشک حد تک وسیع تھیں۔ ہر موضوع پر وہ بے تکلف گفتگو کا عادی تھا۔ جنگ ستمبر کے تمام واقعات اسے ازبر تھے اور شہیدوں کے بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔"

راشد منہاس اپنے دوستوں میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اکثر وہ ان کے ساتھ کھیلتے لیکن کبھی کوئی ناگوار حادثہ نہ ہوا۔ ان کی باتیں دلچسپ اور معلوماتی ہوا کرتی تھیں وہ دوستوں کو بہادر جرنیلوں کے قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے اور ان میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ بڑے پھرتیلے

اور چست تھے۔ کوئی کام ہوتا جلد ختم کرنے کے عادی تھے۔ کسی نے ان کے چہرے پر کبھی تھکن نہ دیکھی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ بہترین کار ڈرائیور تھے اور اچھی ڈرائیونگ کر لیا کرتے تھے۔

راشد منہاس کو اقبالؒ سے بہت عقیدت تھی ان کی بعض نظموں کے انگریزی ترجمے ان کی ڈائری میں موجود ہیں۔

راشد کے بچپن کی بڑی عجیب و غریب اور پر لطف باتیں ہیں۔ لیکن ایک بات جس کا سب کو اعتراف ہے وہ ہے راشد کی خودداری۔ بچپن میں کھیل کود میں معمولی سی جھڑپیں ہو جاتی ہیں۔ راشد کی بڑی بہن رخسانہ منہاس اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرتی ہیں۔

"ایک مرتبہ تاش کھیلتے ہوئے میرے اور راشد کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور ہم ڈیڑھ سال تک ایک دوسرے سے نہیں بولے اس میں چھوٹا ہونے کے باوجود اتنی خودداری تھی کہ وہ پہلے بول چال شروع کرنے کو تیار نہ تھا آخر یہ کوشش مجھے ہی کرنی پڑی۔ ہوا یوں کہ میں کچھ عرصے کے لیے لاہور گئی۔ وہاں سے میں نے راشد کی پسندیدہ ایک کتاب بھیجی اور یوں ہم میں صلح ہو گئی۔ لیکن جب صلح ہوئی ایسے لگتا تھا جیسے ہم دونوں کبھی لڑے ہی نہ تھے۔"

راشد منہاس کو اپنے بہن بھائیوں سے بے حد محبت تھی۔ وہ ہر ہفتہ چھٹی پر گھر آتے تو رات گئے تک کسی کو نہ سونے دیتے۔ اپنی ائیر فورس کی باتیں، دوستوں کے قصے اور پڑھی ہوئی باتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رات گزار دیتے اور اکثر یوں ہوتا کہ جب جانے لگتے تو چپکے سے چلے جاتے۔ ان کی اس بات سے ان کی ماں کو بہت گلہ تھا لیکن جب آخری بار گھر سے رخصت ہوئے تو خلاف معمول گھر والوں کو خدا حافظ کہا۔ حیرت سے سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ وہ اتنے مؤدب کیسے ہو گئے۔ راشد کی اس تبدیلی پر سب بہت خوش ہوئے اور انہیں پیار سے رخصت کیا۔

بچوں کو اپنے والدین سے پیاری اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور خود والدین بھی

انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ راشد کو اپنے والد سے جو محبت تھی اس محبت کا ظہور ان کی شہادت سے ایک روز پہلے ہوا۔19اگست 1971ء کا ذکر ہے۔ جمعرات کا روز تھا۔ راشد کے والد عبدالمجید منہاس اچانک راشد سے ملنے کے لیے بے قرار ہوگئے اور انہیں ملنے کے لیے پاکستان ائیر فورس ماری پور کے مسرور اسٹیشن پر چلے گئے۔ اس وقت راشد اپنے میس میں کھانے کے لیے گئے تھے۔ چنانچہ عبدالمجید منہاس وہیں چلے گئے انہیں دیکھتے ہی راشد اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ راشد کے والد نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

خوشی سے وہ پھولے نہیں سما رہے تھے اور یہی کہہ رہے تھے کہ وہ خود ملنے کو بے تاب تھے۔ اس کے بعد راشد نے انہیں ساتھ مل کر کھانے کو کہا۔ اس کے والد نے ہر چند انکار کیا اور گھر جا کر کھانے کا کہا لیکن راشد کا اصرار بڑھتا گیا اور انہیں بھی مل کر کھانا پڑا۔ کھانے کے دوران ان کے والد جب پانی پینے لگے تو راشد نے ضد کر کے انہیں سیون اپ پلائی۔ اس وقت راشد کا پھول جیسا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس ملاقات سے فارغ ہو کر ان کے والد نے انہیں گھر چلنے کو کہا۔ لیکن اس روز راشد کو کھیلوں پر جانا تھا اور اگلے روز ان کی سولو فلائٹ (تنہا پرواز) تھی۔ مجید منہاس جب راشد سے مل کر گھر آئے تو بہت خوش تھے اور جب انہوں نے گھر آکر راشد کی اگلے دن کی تنہا پرواز کی خبر سنائی تو راشد کی بہنیں بہت خوش ہوئیں کہ راشد اس فلائٹ کے بعد ضرور کچھ تحائف دیں گے کیونکہ جب راشد پہلے تنہا پرواز سے کامیاب لوٹے تھے تو انہوں نے مٹھائی کھلائی تھی ان کی بہنیں دل ہی دل میں تحفوں کا سوچنے لگیں لیکن راشد نے جو تحفہ دیا وہ بہت عجیب و غریب اور انوکھا تھا اور یہ تحفہ پوری پاکستانی قوم کے لیے تھا۔

راشد کے والد بے تاب تھے کہ راشد جب پرواز سے لوٹیں گے تو وہ ان سے پرواز کے بارے میں بات چیت کریں اور کچھ پوچھیں۔ اسی لیے وہ فضائیہ کے ایک افسر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے گیارہ بجے راشد کی پرواز تھی اور خیال تھا کہ ساڑھے بارہ بجے تک وہ پرواز سے واپس آجائیں گے۔ راشد کے والد تقریباً ایک بجے تک اپنے دوست فضائیہ کے افسر کے پاس بیٹھے رہے لیکن راشد نہ آئے۔ اس پر انہیں قدرے

تشویش ہوئی۔ لیکن راشد کے دوساتھیوں اور فضائیہ کے افسر نے انہیں مطمئن کر دیا۔ کیونکہ بعض اوقات پرواز لمبی ہو جانے سے کچھ تاخیر بھی ہو جایا کرتی ہے۔ راشد کے والد راشد سے ملے بغیر واپس چلے گئے اور جب گھر جا کر انہوں نے یہ بات راشد کی والدہ کو بتائی تو ممتا کی اندھی دیواریں لرز اٹھیں اور ہونٹ دعا کے لیے پھڑپھڑانے لگے۔ رات گئے ان کے اضطراب میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے راشد کے والد سے اصرار کیا کہ وہ راشد کے سکواڈرن لیڈر سے دریافت کریں اور راشد کا پتہ چلائیں لیکن ان کے والد نے انہیں دلاسا دیا اور مطمئن ہو جانے کو کہا کیونکہ اگلے روز ہفتہ تھا اور معمول کے مطابق راشد نے دوپہر کا کھانا گھر کھانا تھا۔ ممتا ایسے لفظوں سے کیسے مطمئن ہوتی ہے، وہ ساری رات راشد کی امی نے آنکھوں آنکھوں میں گزار دی۔

اگلے روز ہفتہ تھا۔۔۔ راشد نے گھر آنا تھا۔ ماں باپ بے قراری سے اس کی آمد کے منتظر تھے۔ بہنوں کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ آج راشد کی پسند کی چیزیں پلاؤ اور آلو گوشت پکایا جا رہا تھا۔ آخر وہ وقت آپہنچا جب راشد کو نہ آنا تھا لیکن یہ وقت بھی سرک گیا اور بے قراریاں بڑھ گئیں۔ تب راشد کے والد متفکرانہ انداز میں فون پر فون کرنے لگے۔ بالآخر فضائیہ کے ہیڈ کوارٹر سے یہ اطلاع ملی کہ راشد کے سکواڈرن لیڈر ان کے گھر آرہے تھے۔ راشد کے والد کا خیال تھا کہ راشد سے ڈسپلن میں کوتاہی یا کوئی سنگین غلطی ہوئی جس کی شکایت کے لیے اس کے سکواڈرن لیڈر گھر پر آرہے ہیں۔ ممتا کی ماری ماں بار بار سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی کہ سکواڈرن لیڈر کیوں آرہے ہیں لیکن مجید منہاس کے ہونٹوں کو خود چپ سی لگی تھی اور وہ آنے والے وقت کے بے چینی سے منتظر تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد راشد کے سکواڈرن لیڈر پہنچ گئے لیکن راشد کے عظیم ماں باپ کے سامنے وہ سوائے سر جھکا کر کھڑے ہونے کے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ بالآخر انہوں نے اپنی تمام تر توتوں کو اکٹھا کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ ان کا بیٹا وطن پر قربان ہو گیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ راشد کا راستہ دیکھنے والی آنکھیں بے ہمت ہو کر آنسو برسانے لگیں، بہنیں چیخ چیخ کر راشد کو پکارنے لگیں اور گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ راشد کے سکواڈرن لیڈر نے اطلاع دی کہ شہید کا جنازہ تیار ہے اسے گھر لایا جائے یا قبرستان پہنچایا

دیا جائے۔ مجید منہاس نے بڑے حوصلے سے آنکھیں خشک کیں اور کہا:

"مسافر کو اس کی منزل تک لے جاؤ ہم اپنے دولہا کی برات میں شرکت کے لیے خود آتے ہیں۔"

رشتے داروں کو اپنے خاندان کے چہیتے کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ اشکبار آنکھیں اور سوگوار دل لیے کراچی پہنچے۔ راشد کے چچا بھی لاہور سے کراچی پہنچ گئے۔ راشد کے والد نے انہیں رونے سے منع کر دیا اور سمجھایا کہ شہید کی یاد میں رویا نہیں کرتے، راشد کے چچاؤں نے اپنے آنسوؤں کے ضبط کے بند باندھ لیے۔ ایک چچا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور اپنے باپ کی روح سے مخاطب ہو کر بولے:

"آپ کے پوتے نے خاندانی روایات کو قائم رکھا ہے اور اسلام کی خاطر مر مٹا ہے اس مقدس خون کو دربار رسالتؐ میں پیش کر دیجیے گا۔"

فضائی معرکہ — شہادت

20 اگست کی صبح طلوع ہوئی۔ اس روز کا سورج معمول سے زیادہ درخشندہ اور تیز تھا۔ دریائے سندھ کے بائیں کنارے لہلہاتے ہوئے کھیت میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آگ کے شعلے بلند ہوئے اور روشنی کی ایک لکیر پھوٹتی ہوئی آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔ اردگرد کام کرنے والے لوگوں کا جم غفیر فوراً اکٹھا ہو گیا۔ عجیب دہشت کا عالم تھا ہر کوئی راز جاننے کی کوشش میں تھا۔ لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ یہ آگ کیسی ہے — یہ نور کی دھار جو آسمان کا سینہ چیرتے ہوئے گزری ہے کیسی ہے اور جب انہیں یہ پتہ چلا کہ یہ بیس سالہ کمسن پائلٹ کی جرأت مندی اور حب الوطنی کا کارنامہ ہے جس نے ایک غدار کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی ہے تو ان کی گردنیں مارے عقیدت کے خم ہو گئیں۔

رسالپور اکیڈمی سے تربیت حاصل کرنے کے بعد کیڈٹوں کو تربیتی پرواز پر روانہ کیا جاتا ہے۔ 20 اگست بروز جمعہ پاک کے تین طیارے تین تین منٹ کے وقفے سے پرواز پر روانہ ہوئے۔ ان میں سے تیسرا طیارہ راشد منہاس کا تھا۔ تقریباً

11 بجکر 26 منٹ کا وقت تھا۔ راشد منہاس اپنے ٹرینر جیٹ طیارے ٹی 303 میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ طیارہ دوہرے کنٹرول کا تھا۔ یعنی اس میں کیڈٹ اور انسٹرکٹر دونوں کے لیے کنٹرول پینل ہوتے ہیں۔ اکثر جب زیر تربیت پائلٹ پرواز پر روانہ ہوتا ہے تو اس کے پیچھے دوسری نشست پر انسٹرکٹر ہوتا ہے اور اسے مناسب ہدایات دے کر ٹرینڈ کرتا ہے۔ لیکن کینوپی بند ہو جانے کے بعد جگہ اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ وہ آپس میں متصادم نہیں ہو سکتے۔ تمام انتظامات کے بعد ٹھیک گیارہ بج کر 26 منٹ پر راشد منہاس کو کنٹرول ٹاور سے پرواز کی پہلی کلیرنس ملی اور انہوں نے جہاز کو رن وے پر چلانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ جہاز کی رفتار بڑھتی گئی۔ ابھی طیارہ رن وے پر ہی تھا کہ راشد منہاس کا غدار انسٹرکٹر فلائیٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمٰن ٹرامک کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس وقت وہ اپنی اوپل کار میں سوار تھا۔ جلدی سے کار سے اتر کر اس نے راشد کو خطرے کا سگنل دیا۔ راشد سمجھا کہ شاید طیارے میں کوئی فنی خرابی ہو گئی ہے لہٰذا وہ رک گئے۔ ویسے بھی مطیع الرحمٰن ان کے انسٹرکٹر تھے اس لیے راشد کو رکنا لازمی تھا۔ لیکن معصوم راشد کو اپنے غدار انسٹرکٹر کے مکروہ عزائم کا قطعی علم نہ تھا۔ طیارہ روک کر انہوں نے اپنے منہ سے گیس ماسک ہٹاتے ہوئے جہاز روکنے کی وجہ پوچھی۔

غدار انسٹرکٹر موقع کی تلاش میں تھا۔ جہاز رکتے ہی اس نے ایک جست لگائی اور کاک پٹ میں داخل ہو کر راشد کی پچھلی سیٹ پر قبضہ کر لیا حالانکہ نہ تو اسے تربیتی پرواز میں ہمراہ جانے کی اجازت ملی تھی اور نہ ہی وہ وردی پہنے ہوئے تھا۔ ایک لمحے کے لیے راشد کو اپنے انسٹرکٹر کے اس طرح اچانک چلے آنے پر حیرت ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ انسٹرکٹر کے خطرناک ارادوں کو بھانپ گیا۔

غدار انسٹرکٹر نے حفظ ماتقدم کے طور پر سب کچھ مکمل کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی غداری کے بعد اس کے بیوی بچے محفوظ نہ رہ سکیں گے اس لیے اس نے طیارہ میں بیٹھتے ہی سب سے پہلے وائرلیس کے ذریعے اپنے دو ساتھیوں کو پیغام دیا جو کراچی میں تھے اس پیغام میں اس نے بتایا کہ وہ جودھپور جا رہا ہے اس لیے وہ اس کے بیوی بچوں کو ہندوستانی ہائی کمیشن میں لے جائیں اور تحفظ دلوائیں۔

اس پیغام کو سن کر راشد پر اپنے انسٹرکٹر کی شیطنت اچھی طرح واضح ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ راشد منہاس کچھ کر سکتے انسٹرکٹر نے دوہرے کنٹرول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پرواز شروع کر دی اور جہاز کا رخ بھارت کی طرف کر دیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر راشد نے فوراً ماڑی پور کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا اور 11 بج کر 29 منٹ پر یہ پیغام دیا۔

"مجھے اغوا کیا جا رہا ہے ـــــ تم غدار کے ساتھیوں کو ہندوستانی ہائی کمیشن میں پناہ نہ لینے دو۔"

یہ پیغام سنتے ہی کنٹرول روم میں بیٹھے ہوئے سب لوگ سکتے میں آ گئے اور راشد کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ جہاز کو پرواز نہ کرنے دیا جائے اور بھارت میں نہ جانے دیا جائے۔

غدار مطیع الرحمٰن نے کلوروفارم سے بھیگا ہوا رومال راشد کے منہ پر رکھا لیکن راشد نے اپنے حواس بحال رکھے۔ مطیع الرحمٰن جسمانی لحاظ سے راشد سے کہیں مضبوط تھا اور پھر وہ راشد سے زیادہ ماہر پائلٹ تھا اس لیے اس نے جہاز کا کنٹرول سنبھالتے ہی ہندوستان کی طرف پرواز شروع کر دی۔ اس وقت اس کے پاس چند اہم دستاویزات تھیں جو وہ ہندوستانی حکومت کے لیے لے جا رہا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر کاغذ ضائع کر بھی دیئے جاتے تو غدار مطیع الرحمٰن جان بچا کر بھاگ سکتا تھا اور کئی اہم راز دشمن کو سونپ سکتا تھا۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا اور اس اہم ترین مرحلہ میں راشد نے ایک فیصلہ کرنا تھا ـــــ ایک ایسا فیصلہ جس پر پوری قوم کی قسمت کا انحصار تھا۔ ایک طرف ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبت تھی ـــــ دوسری طرف ملک و ملت کی سلامتی کا سوال ـــــ ایک طرف پرکشش زندگی اور روشن مستقبل تھا اور دوسری طرف موت۔

لیکن اللہ کے شیر حق پر ڈٹ جاتے ہیں وہ نتائج کی پروا نہیں کرتے ـــــ انجام کیا ہوگا وہ یہ سب اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ راہ حق کے اس شہید نے بھی یہی کچھ کیا۔ مطیع الرحمٰن کے ناپاک ارادوں کا انہیں علم ہو چکا تھا اور وہ جان چکے تھے کہ غدار وہ طیارہ پاکستان کے ازلی ابدی دشمن بھارت لے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ راشد نے زندگی کو داؤ پر لگا دیا ـــــ وہ انسٹرکٹر سے گتھم گتھا ہو گئے لیکن انہیں بے بس کر دیا گیا۔

غدار انسٹرکٹر راشد کو نیچی پرواز کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور جام نگر کے ہوائی

اڈے کی طرف چلنے کا حکم دے رہا تھا۔ لیکن راشد اسے بلندی پر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غدار پرواز کا لباس پہنے ہوئے نہیں اور نہ ہی اس کے پاس آکسیجن ہے اس لیے وہ اسے آکسیجن کے بغیر مارنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر چالاک اور ہوشیار مطیع الرحمٰن نے ایسا نہ ہونے دیا اور طیارہ زمین سے تیس چالیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا رہا۔ چونکہ طیارہ بہت نیچے ہونے کی وجہ سے ریڈار کی رینج میں نہ تھا اس لیے ریڈار والوں کو اس کی صحیح سمت کا اندازہ نہ ہوا۔ پاک فضائیہ کے دو طیارے راشد کی حفاظت کے لیے پرواز پر روانہ ہوئے لیکن وہ طیارے بہت بلند تھے اور راشد کا طیارہ بہت نیچے تھا اس لیے یہ طیارہ فضائیہ کے طیاروں اور ریڈار کی حدود میں نہ آسکا۔

11 بج کر 33 منٹ پر راشد نے تیسری بار کنٹرول کو سگنل دیا اور کہا کہ انہیں اغوا کیا جا رہا ہے لیکن وہ طیارے کو اغوا نہ ہونے دیں گے اس وقت راشد کی آواز بہت بھرائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی راشد کا کنٹرول ٹاور سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ غدار انسٹرکٹر طیارے کو اور نیچے لے آیا۔ ظاہر ہے کہ اتنی نیچی پرواز کو راشد جیسا نوآموز پائلٹ کامیاب نہیں بنا سکتا اور طیارہ غدار مطیع الرحمٰن کے کنٹرول میں تھا۔

جوں جوں وقت بیت رہا تھا راشد کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ ان کے کمزور بازوؤں میں غضب کی قوت پیدا ہو چکی تھی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر طیارے کو بھارت میں نہ جانے دیں گے۔ غدار نے آخری بار انہیں انعام و اکرام کا لالچ بھی دیا لیکن راشد نہ مانے اور دونوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ مطیع الرحمٰن باوجود مسلح اور ہٹا کٹا ہونے کے راشد کے ارادوں کو زیر بار نہ کر سکا۔ طیارہ زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ غدار انسٹرکٹر نے ایک بار پھر زور لگایا اور راشد کو پرے دھکیل دیا۔ طیارہ چند سیکنڈ کے لیے فضا میں پھر بلند ہوا۔ اب کشمکش زوروں پر تھی۔ غدار طیارے کا رخ ہندوستان کی طرف کر رہا تھا اور راشد وطن کی سرحد کو غدار کے ہمراہ عبور کرنا اپنی توہین سمجھتے ہوئے طیارے کو زمین کی طرف لا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد طیارہ ہندوستان کی حدود میں داخل ہونے والا تھا کہ راشد منہاس کے بازوؤں میں قوت حیدری پیدا ہو گئی اور انہوں نے پوری قوت سے اس آلے کو دبا دیا جو جہاز کو نیچے لاتا ہے۔

اب طیارہ ہولناک رفتار سے زمین کی طرف آنے لگا تھا۔ غدار کو اپنی موت صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے وہ طیارے کو اوپر کی طرف لیجانے کی کوششیں کر رہا تھا لیکن عظیم راشد اپنا مشن پورا کر چکے تھے ـــــ وہ اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ طیارہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور اس کے اٹھتے ہوئے شعلوں نے غدار کو خاک بنا دیا ـــــ وہ جو وطن عزیز سے غداری کر رہا تھا اس کا نشان بھی نہ رہا ـــــ اور جس نے وطن کی ناموس کو ایمان بنا لیا، اور ارض پاک کا کمسن دولہا تھا ایسے نقوش چھوڑ گیا جو سدا جگمگائیں گے اور آنے والوں کو روشنیوں کا پیغام دیں گے۔

تو جان دے کے ہمیں دے گیا ہے ایک نوید
ہزار رحمتیں نازل ہوں تجھ پہ میرے شہید

راشد منہاس نے اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیا کہ جنہیں زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ موت سے نہیں ڈرا کرتے۔ جو قربانی دینا جانتے ہوں وہ ہنستے مسکراتے موت کی وادیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ راشد نے یہ ثبوت بھی فراہم کیا ہے کہ وطن کے محافظوں کا جذبہ ناقابلِ تسخیر ہے اور وہ وطن کی حرمت بچانے کے لیے جان پر کھیل جایا کرتے ہیں۔ راشد شہید کی اس عظیم قربانی، بے مثال بہادری اور جان سپاری پر پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف نے ان کے لیے "ستارۂ جرأت" کے اعزاز کی سفارش کی مگر راشد کا کارنامہ اتنا بڑا تھا کہ صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خاں نے انہیں عسکریت کا سب سے بڑا اعزاز "نشانِ حیدر" دیا۔

تاثرات واظہار عقیدت

راشد منہاس کی شہادت کے بعد ان کے والد نے ایک ملاقات میں بتایا

"راشد کی شہادت کی اطلاع ملی ـــــ اگر یہ اس کی جرأت مندانہ شہادت کی اطلاع نہ ہوتی تو ہم اس صدمہ کی تاب نہ لاتے ہوئے خود بھی ختم ہو جاتے مگر اللہ نے اتنا بڑا رتبہ راشد کو عطا فرمایا کہ اس جرأت مندانہ اقدام نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔"

راشد منہاس کے لیے نشان حیدر کے اعزاز میں ایک تقریب میں پاک فوج کے بے شمار افسران موجود تھے۔ سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ شہید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا

"راشد منہاس شہید نے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی جان عزیز وطن کی سلامتی پر نثار کر دی۔ اس کے تشکر کے طور پر وطن نے اپنا سب سے اعلیٰ اعزاز راشد منہاس شہید کے حضور پیش کر دیا۔ اگرچہ یہ اس قربانی کا ہرگز ہرگز بدل نہیں ہے لیکن ہم ایسے جاں نثاروں کے لیے اپنی طرف سے جو سب سے اعلیٰ نذرانہ پیش کر سکتے ہیں وہ نشان حیدر ہی ہے۔ راشد منہاس نے کم عمر ہونے کے باوجود وطن کی عزت کا پاس رکھا۔ اس نے وطن کے وقار اور آبرو پر آنچ نہ آنے دی۔ ایک غدار کے ہاتھوں بے بس ہو کر دشمن کی سرزمین پر زندہ پہنچنے اور وطن کی عزت کو داغدار کرنے کی بجائے وطن کی سرزمین پر ہی جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے اور غداری کے منصوبہ کو ناکام بنانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جب راشد منہاس کی شہادت کی اطلاع سنی تو ان کے والدین کے نام ایک پیغام میں کہا

"ایسے ہی بہادر فرض شناس نوجوان قوموں کی تاریخ بناتے ہیں۔ راشد شہید جیسے فرزند قوم کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ اس کی قربانی مثالی ہے اور اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

پاک فضائیہ کے سابق کمانڈر انچیف ایئر مارشل اے رحیم خاں نے ایک ہفت روزہ کے نام خصوصی پیغام میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

"اپنے ملک کے وقار اور ناموس پر مر مٹنے والے راشد منہاس (شہید) کی روایت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اگرچہ راشد میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو کہ انہیں پاکستان ایئر فورس میں اعلیٰ مقام دلانے میں مدد و معاون ثابت ہوتیں لیکن راشد نے اپنے

کیریئر کی ابتدا ہی میں ایک ایسا کارنامہ انجام دیا کہ جس سے انہیں وہ رتبہ حاصل ہوا جو شائد بہت کم لوگوں کو نصیب ہو۔

پاکستان ایئر فورس میں ایسے افسروں اور جوانوں کی کمی نہیں جو وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی تربیت ہی کچھ اس ڈھب سے ہوئی ہے کہ وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوں۔ اس جذبے کا ایک واضح ثبوت ستمبر 1965ء کی جنگ ہے جس میں پاک فضائیہ نے دشمن پر فضائی برتری برقرار رکھی اور بری فوج کو متواتر امداد فراہم کی۔ حب الوطنی اور خلوص نیت کے بغیر اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن پر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ دراصل ہمارا فلسفہ حیات ہی یہ ہے کہ اگر میدان کارزار میں کام آئے تو شہید اور سرخرو ہوئے تو غازی۔

چنانچہ اسی فلسفۂ حیات کو ہم نے میدانِ کارزار میں عملی جامہ پہنایا۔ راشد منہاس کی شہادت بھی اسی فلسفے کی رہینِ منت ہے۔

راشد منہاس کا کارنامہ پاکستان ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہے گا۔"

ایئر مارشل نور خاں راشد منہاس کے بارے میں کہتے ہیں:

"شہید میں جرأت و بے خوفی، یقین محکم اور جذبۂ قربانی کے تینوں اوصاف موجود تھے اور دشمن کے ساتھ کشمکش کے نو منٹ میں راشد کی نفسیاتی برتری یوں ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا جبکہ اس کا حریف پوری منصوبہ بندی کے بعد ہوائی جہاز میں کودا تھا۔ راشد حالت جنگ میں نہیں تھا اور کلوروفارم کا اثر بھی اس کے حواس کو درہم برہم کر رہا تھا۔ ایئر فورس اس سے یہ توقع بھی نہیں رکھتی تھی کہ وہ اپنی جان گنوا کر ہوائی جہاز کو ضرور بچائے وہ اگر اپنی جان بچا لیتا اور جہاز دشمن کے حوالے کر دیتا تو ایئر فورس کے قواعد و ضوابط

اسے مجرم نہیں گردان سکتے تھے لیکن راشد نے بے مثال قربانی دے کر ملک و قوم کا سر ایک ایسے بحرانی دور میں بلند کیا جب ہم پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔"

سکواڈرن لیڈر پیر اکرم راشد منہاس شہید کے بارے میں اپنے جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں:

جبینِ غیرتِ ملت کی روشنی، راشد!
بہارِ صبحِ وطن تو، نگارِ صبحِ وطن
وقارِ صبحِ وطن، جاں نثارِ صبحِ وطن
خوشا، یہ تجھ کو شہادت کی زندگی، راشد!

اُٹھا زمیں سے تو سوئے فلک روانہ ہوا
نگاہ و رفعتِ شاہیں ترا نصیب ہوئیں
پلک جھپکتے ہی سب منزلیں قریب ہوئیں
ترا عدو تری حکمت سے خود نشانہ ہوا

وہ ننگِ دین و وطن تجھ سے بچ کے جا نہ سکا
فضائے ارضِ مقدس کی سرحدوں کے اُدھر
بہت اُڑان پہ اپنی اُسے تھا ناز مگر
وہ تجھ سے بچۂ شاہین کی تاب لا نہ سکا

وہ منزلیں جنہیں اب تک نہ پا سکا تھا کوئی
بفیضِ جذبِ دروں تجھ کو ہو گئی ہیں نصیب
بطفیلِ شہپرِ ہمت خود آ گئی ہیں قریب
وہ رفعتیں کہ جہاں تک نہ جا سکا تھا کوئی

رُخِ عروسِ وطن میں تو بھر گیا غازہ
ترے لہو سے درخشاں نگارِ شامِ وطن
تجھی سے عزت و ناموس و تاب و نامِ وطن
تو رسمِ حیدرِ کرار کر گیا تازہ

خلوص و حبِ وطن، شوق و مہر و صدق و صفا
انہی نقوش سے ایوانِ دل سجائیں گے
ہزار شمعیں ترے نام کی جلائیں گے
تو آفتابِ خودی ہے، تو شہر یارِ وفا

پیام لایا ہے خلدِ بریں سے یہ قاصد
طفیل و سرور بھٹی سلام کہتے ہیں
وہ جن کو صاحبِ عالی مقام کہتے ہیں
انہی شہیدوں میں شامل ہے نوجوان راشد

پانچویں نشان حیدر

میجر محمد اکرم شہید

ضلع جہلم کے دور افتادہ علاقے میں ایک سکول ہے اس سکول کے ایک ماسٹر صاحب نے بچوں سے فیسیں وصول کیں اور رومال میں باندھ کر میز پر رکھ لیں لیکن چھٹی کے وقت وہ یہ رقم وہیں میز پر بھول کر چلے گئے۔ چھٹی ہو گئی اور ایک ایک کر کے سب بچے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اچانک ماسٹر صاحب کو اپنی فیسوں کو خیال آیا۔ وہ گھبرائے ہوئے کلاس روم میں آئے تو دیکھا ان کی جماعت کا مانیٹر رومال لیے ماسٹر صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ ماسٹر صاحب اس بچے کی ایمانداری سے بہت متاثر ہوئے اور سکول میں بچے کی ایمانداری بطور مثال کے پیش کی جانے لگی۔

یہ ایماندار بچہ جو بچپن ہی سے دوسروں کے مال و دولت کا امین و محافظ تھا' پانچویں جماعت کا مانیٹر محمد اکرم تھا جس نے بڑے ہو کر حب الوطنی کا تقاضا پورا کر دکھایا اور جاں نثاری کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو ہمیشہ ابنائے وطن کے دل گرماتی اور انہیں یہ یاد دلاتی رہے گی کہ وطن کی آن پر کبھی حرف نہ آنے دینا اور اس کے لیے اپنی جان تک نثار کرنے میں جھجک محسوس نہ کرنا اور جسے عظیم الشان قربانی پر سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشان حیدر" ملا۔

خاندان

میجر محمد اکرم شہید کا خاندان فوجی خاندان ہے۔ ان کے آباؤ اجداد فوج میں

نمایاں کارنامے سرانجام دے چکے ہیں اور کچھ اب بھی پاک فوج میں شامل ہیں۔ میجر اکرم کے دادا صوبیدار راجہ خاں بیس سال تک فوج میں ملازم رہے۔ 1914ء میں جب پہلی عالمی جنگ نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو صوبیدار راجہ خاں اس جنگ میں پیش پیش تھے اور تقریباً تین چار سال تک اس جنگ میں مختلف محاذوں پر مصروف عمل رہے۔ اپنی جرأت و بہادری و وفاداری کی بدولت حکومت سے فوجی تمغوں کے علاوہ ضلع ملتان میں دو مربع زمین بھی حاصل کی۔ 1917ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے ملک سخی محمد والد میجر اکرم شہید نے بھی اپنے لیے فوج ہی کو منتخب کیا اور 1918ء میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے اور تقریباً اٹھارہ سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد 1937ء میں ریٹائر ہو گئے۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں بھی شریک ہوئے تھے اور جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہی فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور فوج کے پنشنر سردار ہیں۔

میجر اکرم شہید کے خاندان کے کئی دوسرے افراد بھی فوج سے منسلک رہے۔ ان کے تایا صوبیدار میجر ملک گوڈر خاں نے فوج سے پنشن پائی۔ گوڈر خاں کے چچا جیون خاں اور وزیر خاں بالترتیب حوالدار اور صوبیدار میجر کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ملک جیون خاں ہانگ کانگ میں بھی رہ چکے ہیں اور ملک وزیر خاں نے 1/14 پنجاب رجمنٹ میں اپنی اٹھارہ سالہ ملازمت کے دوران حسن کارکردگی کی بنا پر کئی تمغے حاصل کیے۔ میجر اکرم شہید کے تایازاد بھائی محمد حنیف جو اکرم شہید کے بہنوئی بھی ہیں' فوج میں حوالدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اسی طرح ان کے خاندان کے کئی دوسرے افراد فوج کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے ہیں اور ان کے علاوہ میجر اکرم شہید کے سگے بھائی بذات خود پاک فوج سے متعلق ہیں۔

میجر اکرم شہید کے والد سخی محمد جو فوج میں حوالدار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں' ان کے چھ بیٹوں میں سے چار نے اپنے آباء کا پیشہ یعنی سپہ گری کو پسند کیا۔ ان میں سے میجر اکرم تو جام شہادت نوش کر چکے ہیں' دو بھائی صوبیدار ملک حفیظ اللہ اور لانس نائیک ملک محمد افضل مشرقی پاکستان کے محاذ پر دشمن سے برسرپیکار رہے ہیں۔ بدقسمتی سے جب ڈھاکہ میں صورتحال بگڑ گئی تو وہ بھی دشمن کی قید میں



میجر محمد اکرم شہید نشانِ حیدر

آ گئے۔ اکرم شہید کے بڑے بھائی نائب صوبیدار عبدالرشید مغربی پاکستان میں ایک محاذ پر دشمن کے خلاف سرگرم عمل رہے ہیں۔ چھوٹے بھائی گریجویشن کرنے کے بعد فوج میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور پانچویں بھائی عبدالرزاق محکمہ تار ڈاک سے وابستہ ہیں۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

جہلم سے چھبیس ستائیس میل دور ایک مشہور ٹلہ "جوگیاں" ہے اس کی وجہ شہرت بالناتھ جوگی ہے جس سے ہیر کا عاشق رانجھا جوگ لینے کے لیے گیا تھا۔ اس ٹلے کے دامن میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کا نام نکاکلاں ہے۔ یہاں کی آبادی چار پانچ ہزار افراد سے زیادہ نہیں۔ اس بستی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے کئی جوان وطن عزیز کے دفاع میں اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔ آپ کے والد سخی محمد یہیں کے رہنے والے تھے۔ جن کی شادی محترمہ عائشہ بیگم سے ہوئی جبکہ عائشہ بیگم گجرات کے مشہور قصبہ ڈنگہ کی رہنے والی تھیں۔ محترمہ عائشہ بیگم ایک بار اپنے والدین سے ملنے ڈنگہ میں آئی ہوئی تھیں کہ یہاں میجر محمد اکرم شہید کی ولادت ہوئی۔ اس لحاظ سے ان کی جائے پیدائش ان کے ننھیال گاؤں ڈنگہ ہے۔

میجر اکرم شہید کی نانی اماں محترمہ بی بی کو ان سے بہت پیار تھا۔ اپنے ننھیال میں وہ پانچ سال تک رہے۔ ڈنگہ نامی یہ قصبہ جہاں میجر اکرم کی ولادت ہوئی تھی گجرات سے تقریباً چالیس میل دور کھاریاں رسول پور روڈ پر ہے' پہلے اس کی وجہ شہرت یہاں کی بہترین سونف تھی۔ 1971ء کی جنگ میں میجر جنرل افتخار جنجوعہ دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تو اس بستی کا نام اور مشہور ہو گیا کیونکہ شہید اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح میجر اکرم کی جنم بھومی کی وجہ سے یہ بستی کافی مشہور ہو چکی ہے۔

جب میجر اکرم نے ذرا ہوش سنبھالا تو انہیں ڈنگہ سے ان کے آبائی گاؤں نکاکلاں میں بھیج دیا گیا۔ پانچ سال کی عمر میں یہاں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ 1942ء کا ذکر ہے۔ پرائمری سکول میں چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد 1946ء میں ڈی اے دی مڈل سکول چکری میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گئے اور

چھٹی جماعت تک یہیں پڑھتے رہے۔ ساتویں جماعت کے لیے وہ سرائے عالمگیر کے فوجی سکول میں داخل ہو گئے اور کئی سال تک یہیں پڑھتے رہے۔

شہادت کے وقت ان کی عمر گو تینتیس سال سے زائد تھی' تاہم وہ کنوارے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میجر اکرم شہید کو اپنے چھوٹے بھائیوں کا مستقبل بے حد عزیز تھا' وہ چاہتے تھے کہ یہ تعلیم حاصل کر کے کسی منزل پر پہنچ جائیں اور پھر شہادت سے تین سال پہلے تک وہ مشرقی پاکستان میں تھے۔ گھر والوں کو ان کی شادی کی بڑی خواہش تھی۔ چنانچہ دو گھروں میں ان کی شادی کی بات بھی چل رہی تھی لیکن اس خوشی کے موقع سے پہلے ہی وہ وطن ملک عدم کو سدھار گئے اور مادر وطن کی مانگ میں اپنے لہو سے سیندھور بھر گئے۔

سیرت و کردار

میجر اکرم شہید کا قد لمبا اور جسم سڈول تھا۔ بڑے چست اور چوکس تھے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور کشش تھی۔ لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ طاری رہتی۔ گندمی رنگ اور پرکشش خدوخال کے مالک تھے۔ آواز بے حد سریلی تھی اور جب وہ گاتے تو کسی مشاق گویے کا گمان گزرتا۔ ملٹری کالج میں ان کے دوست ان کی سریلی اور میٹھی آواز کی وجہ سے ان کے بہت پرستار تھے اور انہیں "بلبل نغمہ بار" کا خطاب دے رکھا تھا۔ ان کی سریلی آواز کی شہرت کا اندازہ کالج اکیڈمی کے جریدے "دی رائزنگ کریسنٹ" کی اس رائے سے ہوتا ہے جو میجر اکرم کے بارے میں ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"اگر وہ پردے کے پیچھے گاتے تو سننے والوں کو کسی نسوانی آواز کا شبہ ہوتا اور ان کی دلکش مسکراہٹ اکثر ہر کسی کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی۔"

میجر اکرم عادات کے لحاظ سے بچپن ہی سے دوسروں سے منفرد تھے اور بچوں کی طرح وہ کبھی چیختے چلاتے اور روتے نہیں تھے۔ ان کی والدہ دودھ پلانے کے بعد انہیں پہروں چارپائی پر لٹائے رکھتیں۔ جب ان کے دودھ پینے کا وقت ہوتا اور ان کی والدہ ان کے پاس آتیں تو وہ لپک کر ان کی گود میں آ جاتے۔ ذرا ہوش سنبھالا تو

دودھ ان کی من پسند چیز تھی۔ جب ان کی والدہ برتن میں سے گلاس میں دودھ انڈیلنے لگتیں تو وہ للچائی نظروں سے دیکھتے اور زور زور سے بازو چلانے لگتے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ سارا دودھ انہیں ہی مل جائے۔ دودھ پینے کا شوق انہیں آخر عمر تک رہا اور ان کے دودھ ہی کا شوق خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ چائے کے قطعاً شوقین نہ تھے بلکہ حتی المقدور اس سے پرہیز کرتے لیکن جب کوئی مہمان آتا تو اس کی دلجوئی کے لیے چائے بھی پی لیتے۔ ہمیشہ سادہ غذا کھاتے۔ مرغن اور پر تکلف کھانوں سے احتراز کرتے اور جو چیز مل جاتی اسے شوق سے کھا لیتے' تاہم ان تمام کے باوجود وہ مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ کوئی مہمان آ جاتا تو خوب اہتمام کرتے اور مہمان کی خاطر تواضع میں پھولے نہ سماتے۔

بچپن ہی سے انہیں لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ کبھی شرارتیں نہ کرتے اور پوری پوری توجہ اور محنت سے سبق یاد کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ اول نمبر پر آتے۔ میجر اکرم اپنے اساتذہ کا بہت ادب کیا کرتے تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ایک بار جب وہ اپنے آبائی گاؤں میں گئے تو ان کے پرائمری کے استاد کرم الٰہی نے انہیں پیار سے "میجر صاحب" کہہ کر پکارا۔ میجر اکرم نے نہایت سعادت مندی سے سر جھکا دیا اور کہا کہ انہیں صرف اکرم کہا جائے کیونکہ وہ ان کے بچپن کا اکرم ہی ہے۔

میجر اکرم کا شمار کلاس میں سب سے اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ جماعت کے مانیٹر تھے اور اپنے اساتذہ کے بہترین معاون۔ ان کی ایمانداری کی وجہ سے ان کے ایک استاد نے انہیں لڑکوں سے فیسوں کی وصولی پر مامور کر دیا تھا۔ ذہین اتنے تھے کہ جو بات ایک بار سن لیتے فوراً یاد کر لیتے اور اکثر اپنے دوستوں کو سبق تک پڑھایا کرتے۔

کسر نفسی اور طبیعت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ کبھی یونیفارم پہن کر گھر نہ آئے۔ ایک بار انہیں "ٹلہ جوگیاں" پر اپنی یونٹ کے ہمراہ آنا پڑا اور چونکہ وردی میں ملبوس تھے' اس لیے گھر نہ آئے۔ عام زندگی میں بھی وہ لباس کے معاملے میں درویشانہ عادت کے مالک تھے۔ بس لباس دھلا اور صاف ہونا چاہیے وہ پہن لیتے۔ اکثر گھر میں

پاجامہ قمیص یا تہبند باندھتے۔ کہیں باہر جاتے تو پتلون پہنتے۔ جمعہ کے روز بہت اہتمام کرتے۔ نماز کے بڑے پابند تھے اور گھر کا جو فرد نماز نہ پڑھتا اسے سختی سے ڈانٹتے اور کھانے میں شریک نہ ہونے دیتے۔ ہمیشہ بہت سویرے اٹھتے اور بلاناغہ تلاوت کلام پاک کرتے۔

میجر اکرم شہید کو بچپن ہی سے ہاکی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی طرف سے انہوں نے بہت سے ہاکی میچ کھیلے تھے۔ اپنی یونٹ کی ٹیم میں تو وہ اکثر شریک رہے تھے۔ ایک بار 1946ء میں انہوں نے آرمی انٹر زونل ہاکی چمپئن شپ میں پشاور زون کی طرف سے بھی شرکت کی تھی۔ اچھے کھیل پر انہوں نے بے شمار انعامات حاصل کیے ہیں۔ بیس سے زیادہ کپ تو ان کے گھر میں موجود ہیں اور جو سامان مشرقی پاکستان رہ گیا ہے اس میں نہ جانے کتنے کپ ہوں گے۔ ہاکی کھیلنے کے علاوہ وہ شکار کے بھی شوقین تھے۔ بہترین نشانے کے مالک تھے۔ ان کے کامیاب نشانوں کی بڑی دھاک جمی تھی۔ "رائزنگ کریسنٹ" موصوف کے بارے میں رقمطراز ہے:

> "وہ ہاکی اور باکسنگ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ اپنے ماتحتوں سے سوال جواب کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ انہوں نے ہاکی اور نشانہ بازی میں بہت سے انعامات حاصل کیے تھے۔"

میجر اکرم کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ عسکری تاریخ' جرنیلوں کی زندگی کے حالات و واقعات جنگوں کی تفصیلات جاننے کا انہیں بہت شوق تھا۔ تاریخ اسلام میں انہیں خاصی سوجھ بوجھ تھی۔ ان کی معلومات قابل رشک حد تک وسیع تھیں۔ کسی کو ان کی بات رد کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی یونٹ میں "اتھارٹی سر" کے لقب سے مشہور تھے۔ اقبال اور غالب کے بڑے مداح تھے۔ بلکہ خطوط کے آداب و القاب میں اکثر غالب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ قوم اور وطن سے ان کی محبت ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ 15 جولائی 1971ء کو انہوں نے مشرقی پاکستان سے اپنے والد بزرگوار پنشنر حوالدار ملک سخی محمد کو ایک خط بھیجا جو مندرجہ ذیل ہے۔ یہ خط اسلام' قوم اور وطن کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

"اسلام' قوم اور ملک کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی جان قیمتی نہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ مذہب اور ملک کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربانی کے لیے پیش کریں جو کہ اس سلسلہ میں پاکستان کی جانباز فوج کر رہی ہے۔ اب کس کی قربانی اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوتی ہے' وہ ہم میں سے کسی کو علم نہیں ہے' البتہ ہم میں سے جو جوان یا افسر ملک کی حفاظت میں اپنی جان قربان کرتا ہے' باقی اس پر فخر محسوس کرتے ہیں اور نئے جذبے سے اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عزم کرتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہمارا ایمان ہے کہ موت کا وقت' جگہ اور واقعات سب پہلے سے مقرر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا تو پھر فکر کس بات کی ہے۔ ہمارے لیے یہی بات بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک مذہب اور اپنی افواج کی حفاظت اور فتح کے لیے دعا کرتے رہیں۔ جیسے میں نے اس سے پہلے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات حد تک معمول پر آ چکے ہیں۔ ملک میں جنگ کی کیفیت نہیں ہے۔ سرحدوں پر دونوں قسم کے دشمن سے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی ہے جو کہ باعثِ تشویش نہیں ہے۔ لہٰذا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے' ویسے جس کا وقت پورا ہے' اسے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ آدمی گھر میں بیٹھے بیٹھے یا معمولی حادثے میں مر جاتے ہیں۔ ہم سب کے لیے دعا کرتے رہا کریں اور ہم عزم کئے ہوئے ہیں کہ پاکستان کے دشمنوں کو نیست و نابود کر کے دم لیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے کرنے کی توفیق عطا کرے۔ زیادہ آداب۔

آپ کا بیٹا۔ اکرم ملک۔"

میجر اکرم شہید کو مذہب اسلام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور عالم اسلام کو ایک جسد تصور کرتے تھے۔ کبھی کبھار جب کہیں سے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم

کی خبر آتی تو ان کا خون کھول اٹھتا۔ اسی طرح جب اسلام دشمن یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی اور آگ لگائی تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ اس دکھ کا اظہار وہ اپنی ڈائری میں کرتے ہیں اور اپنے غم و غصے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے انتقام کا عہد کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کیے جانے کا سانحہ پورے عالم اسلام کے خلاف دشمنی اور جارحیت سے بھرپور اقدام ہے۔ اس سانحہ پر دنیا کے تمام ممالک میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ تمام مسلم ریاستوں میں احتجاجی مظاہرے اور ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے مسجد اقصیٰ ان کے ایمان و اعتقاد کی ایک زندہ علامت ہے۔ مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کیے جانے کا سانحہ دراصل اسرائیل کی ان کوششوں کا ایک حصہ ہے جو وہ بیت المقدس کی سرزمین سے مسلم یادگاروں کو نیست و نابود کرنے کے لیے کر رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان صیہونی عزائم کو ناکام بنانے اور اسرائیل کو اس طرح کے اقدامات سے باز رکھنے کے لیے متحدہ طور پر کوشش کریں گے۔ مسلم سربراہان مملکت کی مجوزہ کانفرنس کو فوری طور پر اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے تاکہ بیت المقدس کو صیہونی تسلط سے آزاد کرایا جا سکے۔"

میجر اکرم بڑے فیاض انسان تھے جہاں تک ممکن ہوتا دوسروں کی اعانت فرماتے اور دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنا تن من دھن لٹا دینے کو تیار ہوتے بلکہ یہ ان کے ایثار و قربانی کا ایک ثبوت تھا کہ اتنی زندگی گزارنے کے باوجود انہوں نے شادی محض اس لیے نہ کرائی کہ ان کے چھوٹے بھائی کچھ بن سکیں۔ ایثار و قربانی کا یہ جذبہ جب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا تو ایک دن انہوں نے جان کی بازی بھی لگا دی اور ملک و قوم کو سرخرو کر گئے۔ دوسروں کے ساتھ بڑی تمیز اور خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اپنے ماتحتوں سے ان کا برتاؤ شفقت و محبت سے بھرپور تھا۔ کسی سے کوئی غلطی ہوتی تو

معمولی سی سرزنش کے بعد معاف کر دیتے اور جہاں تک ہو سکتا نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے۔ خوشامدی اور چاپلوسی لوگوں کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ گاؤں میں آتے تو خود لوگوں کے گھروں میں جا کر ملتے۔ لوگ ان کے عہدے کی شان اور دبدبے سے مرعوب ہوتے لیکن میجر صاحب کی خوش دلی' انکساری اور عاجزی ہر قسم کے حجاب کو ختم کر دیتی۔ بزرگوں سے بڑے ادب سے پیش آتے اور سلام میں ہمیشہ پہل کرتے۔ ان کی انہی عادات نے انہیں اپنے ملنے والوں میں ہر دلعزیزی کے علاوہ عزت و تکریم کا درجہ دے رکھا تھا۔

فوجی خدمات

میجر اکرم شہید شروع ہی سے فوج میں جانے کے متمنی تھے اور مڈل پاس کر لینے کے بعد اس خواہش نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ وہ ہر وقت بے تاب رہنے لگے۔ کم عمری اور تعلیم کی کمی کمیشن کی راہ میں حائل تھے اور کمیشن کے حصول کے لیے تمام شرائط کا پورا کرنا بھی ضروری تھا' چنانچہ 1951ء میں وہ فوج میں بوائے رنگروٹ بھرتی ہو گئے اور یہیں تعلیمی کمی کو بھی پورا کر لیا۔ ابتداً انہوں نے سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہونا چاہا لیکن کم عمری کی بنا پر یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔ لہٰذا تقریباً پونے تین سال تک وہ بوائے رنگروٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یہیں سے انہیں 4/14 رجمنٹ جو اب 8 پنجاب رجمنٹ کہلاتی ہے میں بھیج دیا گیا۔

چونکہ مستقل مزاج' محنتی اور ترقی کے خواہاں تھے اس لیے بہت جلد پاکستان آرمی کا سپیشل امتحان پاس کر لیا اس کے بعد کئی فوجی کیڈر پاس کیے اور مختلف درجوں سے ترقی کرتے ہوئے لانس نائیک کے عہدے تک پہنچ گئے۔ چونکہ آگے بڑھنے کا عزم اور سچی لگن تھی اس لیے دن رات اپنے نصب العین کے حصول میں کوشاں رہے۔ بالآخر ان کی محنت اور جذبہ رنگ لایا اور 1961ء میں ریگولر کمیشن حاصل ہو گیا۔ کیڈٹ کی حیثیت سے انہیں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول بھیج دیا گیا۔ کاکول اکیڈمی میں وہ بہت جلد اپنے حکام بالا کی نظروں میں آ گئے۔ اس کے باوجود کہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ لیکن اکیڈمی سے متعلقہ ان کی کارکردگی سب سے نمایاں تھی جس کے صلہ میں انہیں

کیڈٹ سارجنٹ بنا دیا گیا۔

آدمی کسی جگہ بھی کیوں نہ ہو محنت کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ بالخصوص پاک فوج میں محنت اور حسن کارکردگی کو بالکل رائیگاں نہیں جانے دیا جاتا۔ میجر اکرم شہید کی ترقی پسند اور اعلیٰ عزائم کی وجہ سے انہیں کانگو کے وزیر اعظم "لومبا" کے نام کی مناسبت سے "لومبا سارجنٹ" کا خطاب دیا گیا۔ اس خطاب کا سبب میجر اکرم شہید کی نہایت معمولی درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف ترقی تھی کیونکہ کانگو کے وزیر اعظم موصوف نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پوسٹ مین کی حیثیت سے کیا تھا اور ترقی کرتے وزیر اعظم بن گئے تھے۔

میجر اکرم شہید کو 13 اکتوبر 1963ء میں کمیشن ملتے ہی نمبر 4 ایف ایف رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ کیپٹن کے رینک پر ترقی 1965ء میں ملی اور اس عہدے سے ترقی کرتے ہوئے 1970ء یعنی پانچ سال بعد میجر بنا دیئے گئے۔

ستمبر 1965ء میں میجر اکرم شہید پاک فوج میں شامل تھے' اس جنگ کا ایک واقعہ ناقابل فراموش ہے۔ سترہ دن کی جنگ کے بعد جب 23 ستمبر کو سلامتی کونسل نے فائر بندی کا حکم دے دیا۔ پاکستانی جوان اس حکم کی تعمیل میں رک گئے۔ ہندوستانی بھگوڑوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے اکرم شہید کو اس بات کا علم ہو گیا۔ انہوں نے سکھ کرنل کو کہلوا بھیجا کہ اگر اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ سکھ کرنل پر اکرم شہید کے اس آرڈر کا اتنا اثر ہوا کہ دوبارہ آگے بڑھنے کا سوچ بھی نہ سکا۔

معرکہ ہلّی

پاکستان معرض وجود میں آیا تو انگریز اور ہندو اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ حالات دراصل اتنے بے قابو ہو چکے تھے کہ انہیں مجبوراً پاکستان کا وجود تسلیم کرنا پڑا جبکہ وہ اندر ہی اندر قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی اس کامیابی پر کڑھ رہے تھے۔ پاکستان کو قائم ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ہندوؤں نے اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہو گئے۔ اس سلسلہ

میں بعض بڑی طاقتوں کا کردار بھی شرمناک تھا جنہوں نے اس کام میں بھارت کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ہر قسم کی اعانت فرمائی۔ اسی قسم کی ایک سازش کا ظہور ستمبر 1965ء میں ہوا۔ جب ہندوستان نے بزعم خویش ایک رات چپکے سے پاکستان پر حملہ کیا۔ اس حملے کا کیا نتیجہ نکلا۔ اسے پوری دنیا جانتی ہے۔ بھارت کا نہ صرف پاکستان پر قبضہ کرنے کا خواب ٹوٹا بلکہ اسے مجاہدین پاکستان نے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ مدتوں تک اس کی کمر دوہری رہی لیکن یہ زخمی ناگ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا اور اپنی بھرپور کمینگی پر اتر آیا تھا۔ بھارت یہ جان چکا تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر پاکستان سے نہیں نمٹا جاسکتا اس لیے وہ ایسے افراد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو بے ضمیر اور وطن فروش ہوں تاکہ ان کے ذریعے وہ اپنی چالوں میں کامیاب ہو سکے چنانچہ بہت جلد اسے ایسے افراد مل گئے جو ملک و ملت کا سودا کرنے پر فوری رضامند تھے ان میں شیخ مجیب الرحمن پیش پیش تھا۔

شیخ مجیب الرحمن نے پاکستان دشمنوں کے ساتھ مل کر چند خطرناک منصوبے تیار کیے لیکن ان کا بروقت علم ہو جانے پر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ 1967ء میں اسے صدر ایوب مرحوم نے "اگرتلا سازش" کے کیس میں گرفتار کر لیا لیکن مغربی اور مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی پرزور حمایت پر اسے رہا کر دیا گیا۔ پاکستان سے رہا ہوتے ہی مجیب تخریب پسندوں کے ٹولے کا سرگرم رکن بن گیا اور صبح شام اپنی تخریب کاریوں میں لگا رہا ساتھ ہی بڑی طاقتوں کی شہہ پر اس نے اپنے مطالبات کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔

چھ نکات کی آڑ میں بنگالیوں کو ان کے حقوق کی پامالی پر اشتعال دلوایا اور مغربی پاکستان اور بالخصوص پنجابیوں کے ظلم و ستم کے جھوٹے قصے سنائے۔ اس کام میں ہندوستان نے اسے دامے درمے امداد دی اور یہی وہ چھ نکات تھے جس کے ذریعے مجیب الرحمن نے بنگالیوں کی ساری ہمدردیاں سمیٹ لیں اور ان کا محبوب لیڈر بن گیا۔ 1970ء کے عام انتخابات میں اس کی پارٹی عوامی لیگ برسر اقتدار آگئی۔

عوامی لیگ کے برسر اقتدار آتے ہی شیخ مجیب نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے اور 3 جنوری 1971ء کو ایک جلسہ عام میں اس نے کھلم کھلا یہ دھمکی دی کہ اگر

چھ نکات کی بنیاد پر آئین نہ بنا تو خون خرابہ ہو جائے گا۔ چھ نکات پاکستان ہی کے وجود کے لیے خطرہ تھے اور صریحاً ایک بغاوت تھے چنانچہ مجیب کی انہی غلط بیانیوں سے مشرقی پاکستان کی فضا انتہائی ناساز گار ہو گئی اور حالات بغاوت کی صورت اختیار کر گئے۔ مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستان کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی ابتداء ہو گئی اور سول نافرمانی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں۔ ان حالات کو سنوارنے اور مشرقی پاکستان کے دفاع کے پیش نظر مغربی پاکستان سے جناب جنرل ٹکا خاں کو روانہ کیا گیا جنہوں نے بہت جلد حالات کو اپنے قابو میں کر لیا اور ڈاکٹر مالک کو وہاں کا گورنر بنا دیا۔ امن بحال ہوتے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ باغیوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا اور ان باغیوں کی پشت پناہی بھارت کر رہا تھا۔ حالات دن بدن بگڑتے گئے حتیٰ کہ بھارت نے روس کے تعاون سے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور اقوام متحدہ میں پاس ہونے والی قراردادوں کے باوجود جنگ جاری رہی۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا تسلط قائم ہو گیا اور وہ بنگلہ دیش کے نام پر آزاد ہو کر بھارت کی ایک نو آبادی بن گیا۔

مشرقی پاکستان پر حملہ ہندوستان نے 21 نومبر 1971ء کو کیا تھا۔ اس حملے میں اس کی دو بریگیڈ پیدل فوج اور ایک ٹینک رجمنٹ شامل تھی۔ مکار دشمن نے جیسور کے شمال سے شروع ہو کر میلا، سلہٹ، چٹاگانگ، میمن سنگھ اور رنگ پور کے محاذ کھول دیئے لیکن پاکستان کی بہادر افواج کے ہاتھوں اسے ہر طرف شرمناک ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا اور 23 نومبر 1971ء تک اس کی حالت بہت بدتر رہی۔ سخت جانی اور مالی نقصان اٹھا کر بھارت سٹپٹا اٹھا۔ بھارت نوازوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ایوان سیاست میں ایک تہلکہ مچ گیا چنانچہ اس نے ایک اور محاذ کھول دیا اور یہ محاذ اس نے 24 نومبر 1971ء کو ضلع دیناج پور کے علاقے ہلی میں کھولا تھا جس کی روداد ہمارے شہید موصوف میجر اکرم سے متعلق ہے۔

ہندوستان کو اپنی طاقت اور اسلحہ کی کثرت پر جو ناز تھا وہ مسلسل خاک میں ملتا جا رہا تھا اور اسے اپنی تخریبی کارروائیوں کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ دیناج پور پر اس نے بڑی طاقت سے حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں اس کی 20 ویں پہاڑی رجمنٹ کے 165 ویں بریگیڈیئر اور 49 ویں بریگیڈ نے حصہ لیا تھا۔ پھر اسے فضائیہ کے جیٹ

طیاروں کے علاوہ دو سکواڈرن ٹینکوں کی امداد بھی حاصل تھی۔ مگر ان تمام کے باوجود اس کے عزائم خاک میں مل گئے اور وہ پیش قدمی کا جو خواب دیکھ کر آیا تھا نہ صرف وہ خواب ادھورا رہ گیا بلکہ اس کی نیندیں بھی اڑ گئیں۔ اس شکست سے زخم خوردہ ہو کر دشمن اور خطرناک بن گیا' چنانچہ اس نے اگلے روز پہلے سے بھی زیادہ طاقت سے حملہ کیا لیکن جوں جوں وہ اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا' پاکستانی جوانوں کا عزم و استقلال جوان ہوتا جا رہا تھا اور وہ دشمن پر بڑھ چڑھ کر ضربیں لگا رہے تھے۔ یہ دن سنگین صورتحال کی ابتداء تھی چنانچہ حکومت نے بری' بحری فوجوں کے تمام ریٹائر' ریزرو اور چھٹی پر گئے ہوئے فوجیوں کو واپس بلوالیا۔ ملک میں ڈیفنس آف پاکستان رولز نافذ کر دیئے گئے۔ نیز "براؤن آؤٹ" کے احکام جاری کر دیئے گئے۔

دیناج پور کے محاذ پر عبرتناک شکست کھانے کے بعد ہلی کی فوجوں نے پاکستانی علاقے میں داخل ہونے کی سر توڑ کوشش کی لیکن ہمارے مجاہدین سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے۔ اب تک دشمن جہاں بھی حملہ کر رہا تھا اسے منہ کی کھانی پڑ رہی تھی۔ 27 نومبر 1971ء کی رات اس نے مشرقی پاکستان کے تین شہروں میسور' کومیلا اور نواکھلی پر بدستور کئی حملے کیے لیکن ان حملوں کو ہماری بہادر اور جانباز فوج نے پسپا کر دیا۔ اسی روز دشمن کے ایک بریگیڈ نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ ہلی کے مقام پر حملہ بولا تھا مگر ناکام ہوا۔

مشرقی پاکستان میں جنگ بدستور جاری تھی اور اب یہ جنگ مغربی پاکستان کے محاذوں پر بھی شروع ہو چکی تھی۔ دشمن نے مشرقی پاکستان میں ہماری سپلائی اور رابطہ منقطع کر دیا تھا' تاہم ابھی تک ہماری حالت اس سے بہتر تھی۔ بھارت رک رک کر مختلف محاذوں پر قسمت آزمائی کر رہا تھا اور اپنی فرضی کامیابیوں کے اعلانات کر رہا تھا۔ ان تمام کے باوجود ہلی کا محاذ خاص طور پر بھارت کی نظر میں تھا۔ اب تک یہ محاذ سب سے اہم بن چکا تھا۔ اس محاذ پر اس نے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزمانے کے بعد اس نے چھاتہ بردار اتارنے شروع کر دیئے لیکن ہمارے مجاہدوں نے ان کا بھی صفایا کر دیا۔ صرف ہلی کا محاذ ایسا تھا جہاں دشمن کو سخت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ اب اس کی توجہ اور بھرپور کوششیں ہلی کے محاذ کی جانب تھیں۔ ہندوستان کے افسروں کی شدید خواہش

تھی کہ وہ پیش قدمی کریں لیکن ناکام ہو رہے تھے۔ انہی دنوں روس کا جنگی بیڑہ جدید ترین اسلحہ کے ساتھ بحر ہند میں پہنچ گیا۔ یہ ہندوستان کے کھلم کھلا ساتھ تھا۔ 13 دسمبر 1971ء کو بھارت نے تانکیل کے مقام پر اپنی چھاتہ بردار فوج اتار دی اور ہلی کے محاذ پر فوجوں کی تعداد اور اسلحہ میں پہلے سے کہیں اضافہ کر دیا۔

میجر اکرم شہید محاذ پر دشمن سے برسرپیکار تھے۔ ان کا تعلق 4 ایف ایف یعنی قدیم روایات کی حامل فرنٹیئر فورس سے تھا۔ وہ اور ان کے جوان ساتھی کئی روز سے دشمن کے ناپاک ارادوں کی راہ میں حائل ہونے کی وجہ سے اسے بری طرح کھٹک رہے تھے اور وہ مسلسل قسمت آزمائی کرتے ہوئے عاجز آ چکا تھا لیکن ڈھیٹ تھا' اس لیے آگے بڑھنے کی کوشش کو نہ چھوڑا۔

دیناج پور کا محاذ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ دشمن اس محاذ پر قابو پا کر مشرقی پاکستان کے باقی حصوں کی سپلائی کو معطل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے 13 دسمبر 1971ء کو اس نے جان توڑ کوشش کی۔ اس بار اس نے بکتر بند گاڑیوں اور انفینٹری کی مدد بھی حاصل کی۔ مگر 4 ایف ایف اور بالخصوص اکرم شہید کے ساتھی اسے ناکام کیے ہوئے تھے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب دشمن کی بکتر بند رجمنٹ پورے علاقے میں پھیل گئی۔ ہماری فوج جو کئی روز سے دشمن سے برسرپیکار تھی' اسلحہ کی کمی کا شکار تھی' ہماری چند بکتر بند گاڑیاں اس قابل نہ رہی تھیں کہ وہ اپنی پیدل فوج کا ہاتھ بٹا سکتیں جس روز میجر اکرم شہید کی شہادت ہوئی اس روز انہیں بکتر بند گاڑیوں کی مدد بھی نہ پہنچ سکی جبکہ دشمن نے پوری ایک پلٹن اور ایک سکواڈرن ٹینک سے ان کی کمپنی پر حملہ کیا۔ مسلسل کئی روز سے میجر اکرم شہید کی کمپنی دشمن کے حملے سہہ رہی تھی۔ اس کے برعکس دشمن ہر دم تازہ کمک روانہ کر رہا تھا۔ اب میجر اکرم کی کمپنی کی حیثیت بہت کمزور ہو چکی تھی اور صورتحال بے قابو ہو چکی تھی۔

اس نازک مرحلے پر میجر اکرم شہید نے اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا زور بڑھتا جا رہا تھا اور وہ پیش قدمی کرتا ہوا آ رہا ہے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ ٹینک شکن ہتھیاروں سے اسے تہس نہس کر دیں گے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دشمن کو اور قریب آنے دیا۔ دشمن نے اپنے حملوں کے جواب میں جب

مجاہدین کی طرف سے خاموشی سمجھی تو وہ اس خاموشی کو اپنی فتح یابی تصور کرتے ہوئے بدمست ہاتھی کی مانند آگے بڑھنے لگا۔ جونہی دشمن مجاہدین کے نرغے میں آیا انہوں نے ایک دم ہلہ بول دیا۔ دستی بموں' سنگینوں اور رائفلوں کی مدد سے ہمارے جوانوں نے دشمن کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ دشمن جسے اس حملے کے قطعی توقع نہ تھی بہت بوکھلایا اور دست بدست لڑائی میں بھاگ کھڑا ہوا۔ مجاہدین نے چھوٹے چھوٹے ٹینک شکن ہتھیاروں سے ٹینکوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ دشمن کو بھاگتے ہی لیکن میجر اکرم شہید ان کی زد میں آ گئے تو جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کے شہید ہوتے ہی حوالدار عبدالغنی نے کمان سنبھال لی اور دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کرنے لگے۔ اس کسمپرسی اور نہایت برے حالات میں بھی میجر اکرم دشمن کی پسپائی کا باعث بنے رہے جبکہ وہ بظاہر اب نہتے تھے۔ انہوں نے پاک سرزمین کی حفاظت میں اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا اس کے صلہ میں انہیں ''نشان حیدر'' کا اعزاز دیا۔

میجر اکرم شہید کی بہادری' جرأت اور احساس فرض اس بات کا ثبوت ہے کہ وطن کے پاسبانوں نے آخری وقت تک اس عہد کو نبھایا جو ایک فوجی کی حیثیت میں اپنی قوم سے کیا تھا اور انتہائی برے حالات میں بھی وہ پاکستان کی مقدس سرزمین کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے اس وطن کو بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ میجر اکرم کی قربانی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کو ہندو اثرات اور اس کی غلامی سے بچانے کے لیے برادران وطن نے اپنی جان پر کھیل کر بھی کوشش کی۔ یہ قربانیاں تاریخ میں حوالے کا کام دیں گی اور جب سیاست کی تلخیاں چھٹیں گی تو ان کا عزم و خلوص مسلم بنگال میں ایک نئی تڑپ' ایک نئے ولولے اور ایک نئی جدوجہد کا سنگ میل بنے گا۔

ان کی اس شہادت کا علم جب ان کے والدین کو ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجا لائے جس نے انہیں ملک و ملت پر قربان ہونے والا فرزند ارجمند عطا فرمایا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ میجر اکرم کی شہادت سے ان کا سر فخر سے بلند ہے اور وہ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ سرزمین پاک میں ایسے بہادروں کو جنم دے۔

چھٹا نشان حیدر

میجر شبیر شریف شہید

جنگ زوروں پر تھی۔ پاکستانی مجاہدین ہر قیمت پر وطن کی آن اور سالمیت کے تحفظ کا عزم کر چکے تھے اور دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے تھے۔ دشمن اندھادھند فائرنگ کر رہا تھا۔ ایک گولہ آ کے پھٹا تو پاکستان کا جیالا مجاہد شدید زخمی ہو گیا۔ زخمی مجاہد کو فوری طور پر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ زخم گہرے تھے لیکن مجاہد محاذ پر لوٹ جانے کے لیے بے قرار تھا جبکہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ محاذ پر جانے کے قابل نہیں۔ مجاہد کے بڑھتے ہوئے اصرار اور علاج کے لیے مجبور ڈاکٹروں نے اسے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا اور اس وقت تک نہ اٹھنے دیا جب تک اس کی حالت اطمینان بخش نہ ہو گئی۔ چوتھے روز ہوش آتے ہی یہ مجاہد محاذ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت بھی پٹی سے بازو گلے میں لٹکائے ہوئے تھے۔

یہ زخمی مجاہد جس کے دل میں محبت وطن اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی' 65ء کی جنگ کا سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر شریف تھا جو چھمب سیکٹر میں دشمن کے خلاف برسرپیکار تھا اور اپنے جری کارناموں کی وجہ سے ستارۂ جرأت کا اعزاز پایا ـــــ ستمبر 1965ء کی جنگ کا یہ غازی' یہ مرد مجاہد 1971ء کی جنگ میں بھی دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا۔ اس وقت یہ ایک اعلیٰ افسر بن چکا تھا اور اپنی افسرانہ قیادت میں ایسے ولولہ انگیز معرکے انجام دے رہا تھا جو جنگ کے دوران بہادری کے سب سے بڑے واقعات ثابت ہوئے۔ اس جنگ میں میجر شبیر شریف شیر دل افسر جرأت' فرض سے بے لوث

لگن اور نظم وضبط کا بے مثال پیکر بن چکے تھے۔ سلیمانکی سیکٹر میں دشمن کے خلاف لڑتے ہوئے انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی اور بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ''نشان حیدر'' پایا۔

خاندان

میجر شبیر شریف ایک راجپوت خاندان کے چشم و چراغ تھے اور بہادری' جانبازی اور اپنی آن پر مر مٹنے کا جذبہ انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ابتداً اس خاندان کا تعلق ہندو راجپوت گھرانے سے تھا' جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس خاندان کے افراد پہلے پہل کشمیر میں مقیم تھے اور بعد میں ہجرت کر کے گجرات سے مغرب کی جانب پانچ میل دور ایک قصبہ کنجاہ میں آباد ہو گئے۔ ان کے پر دادا میاں محمد بخشؒ تصوف و معرفت الٰہی کی انتہائی منزلوں پر تھے اور ان کی زندگی خدمت خلق اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف تھیں۔

ان کی رحلت کے بعد ان کے فرزند ارجمند میاں غلام حسین نے اپنے باپ کے بتائے ہوئے اصولوں پر چل کر خدمت خلق کا مقدس فریضہ ادا کیا۔ اسی طرح میاں مہتاب الدین نے اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کی تعلیمات کو جاری رکھا اور ساری عمر لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرتے رہے۔ میاں مہتاب میجر محمد شریف کے والد گرامی تھے۔ جن کے صاحبزادے میجر موصوف شبیر شہید تھے۔ میجر محمد شریف ابھی گیارہ سال کے تھے کہ میاں مہتاب الدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گیارہ سال کی عمر میں انسان کو اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی اور اکثر بچے بزرگوں کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر بے راہرو ہو جاتے ہیں مگر بفضل تعالیٰ اس گھرانے کے اچھے اور شستہ و پاکیزہ ماحول نے میجر شریف کو بھٹکنے نہ دیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ ضلع گجرات سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1935ء میں سگنل کور میں سگنل بھرتی ہو کر جبل پور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے فوج کے بہت سے کورس پاس کیے۔ اس کے بعد وہ کچز کالج نوکانگ سے منسلک ہو گئے اور فوج کا سب سے اونچا کورس ''سپیشل آرمی کورس'' پاس کیا۔



میجر شبیر شریف شہید نشانِ حیدر، ستارہ جُرأت

میجر شبیر شریف ایک پکے مسلمان تھے اور انہیں اسلام سے والہانہ لگاؤ تھا۔ کچز کالج میں آنے سے پہلے وہ مشرق وسطیٰ میں رہ چکے تھے اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور زوال پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ وہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے مداح تھے اور انہیں پوری امید تھی کہ اقبالؒ نے قوم کو جو پیغام دیا ہے' قائداعظمؒ اسے ضرور پورا کر دکھائیں گے۔ اکثر وہ مسلمانوں کی حالت پر بہت فکر مند ہو جایا کرتے تھے کہ مسلمان قوم نے اپنے راستے کو چھوڑ دیا ہے اور ان میں ایثار و محبت کا جذبہ ماند پڑتا جا رہا ہے۔ میجر محمد شریف کی آواز بڑی پرکشش اور سریلی تھی۔ جمعہ کے دن جب مسلمان کیڈٹ مسجد میں اکٹھے ہوتے تو میجر شریف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے۔ ان کا ایک پنجابی گانا ان کے ساتھیوں میں بہت مقبول تھا جس کے بول تھے:

او مسلمانا! کتھے گئی مسلمانی تیری
دین لئی ہندی سی کدی وقف زندگانی تیری

میجر شریف کے دل میں اپنی قوم کے لیے جو پیار تھا اس کے کئی واقعات ان کے ساتھی آج بھی حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دوران ملازمت انہیں جب بھی موقع ملتا وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے اسلام کی تبلیغ کرتے۔ مشاہیر اسلام کے ایمان افروز قصے بیان کرتے۔ ان کی خدمات کی وجہ سے ان کے ساتھی انہیں بہت احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فطری طور پر وہ بے خوف نڈر اور صاف گو انسان تھے۔ معاملہ فہمی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا وجود ان کے ساتھیوں کے لیے باعث رحمت تھا جس کا آغاز کرتے اسے نہایت مستعدی اور دیانتداری سے انجام تک پہنچاتے۔ کام سے لگن اور فرض شناسی نے انہیں ترقی کی منازل پر پہنچا دیا چنانچہ وہ ایک عام سپاہی کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے میجر بن گئے اور اسی عہدے سے یعنی بحیثیت میجر 6 جون 1965ء کو ریٹائر ہو گئے۔

میجر شریف کو ریٹائر ہوئے ابھی تین ماہ گزرے تھے کہ پاکستان کو ہندوستانی جارحیت کا سامنا کرنا پڑ گیا اور ستمبر 1965ء کی جنگ میں ان کی خدمات دوبارہ حاصل کر لی گئیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس جنگ میں ان کے ساتھ ان کے دو

صاحبزادے کیپٹن ممتاز شریف اور میجر شبیر شریف بھی وطن عزیز کے دفاع کے لیے سینہ سپر تھے اور ان دونوں عظیم انسانوں نے بالترتیب "ستارۂ بسالت" اور "ستارۂ جرأت" کا اعزاز حاصل کیا۔

میجر شبیر شریف کے خاندان کے بیشتر افراد فوج سے متعلق ہیں۔ ان کے والد کے پانچ بھائی فوج میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کے نانا 1918ء میں 4/6 راجپوتانہ رائفلز سے جمعدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ میجر سعادت علی خاں جن کا تعلق رام پور کے نواب خاندان سے ہے۔ میجر شبیر شریف کے بہنوئی ہیں۔ 1971ء کی جنگ میں وہ سلیمانکی' فاضل کا سیکٹر میں میجر شبیر شریف سے دو سو گز پیچھے ان کے سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے دشمن کے خلاف مصروف عمل تھے۔ جب میجر شبیر شریف شہید ہوئے تو میجر سعادت علی خاں ہی ان کے جسد خاکی کو صندوق میں ڈال کر ان کے گھر لائے تھے۔ میجر شبیر شریف کے ایک بھائی ممتاز شریف فوج میں کیپٹن ہیں۔ ان کے علاوہ دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

میجر محمد شریف کے ہاں 28 اپریل 1943ء کو میجر شبیر شریف کی ولادت ہوئی۔ میجر شریف کو امام حسینؓ سے جو والہانہ عقیدت تھی' اس مناسبت سے انہوں نے اس بیٹے کا نام شبیر شریف رکھا۔ میجر شبیر شریف کی والدہ ماجدہ پرہیزگار اور سادہ طبیعت خاتون ہیں۔ ان کی تربیت نے شروع ہی سے ان میں اچھے اوصاف کی بنیاد ڈال دی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی تعلیم کا باقاعدہ اجراء کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے انہیں سب سے پہلے راولپنڈی میں "پریزنٹیشن کونونٹ" سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے بعد جب ان کے والد کی تبدیلی مری میں ہوئی تو انہیں مری کے "سینٹ میری" سکول میں داخل ہونا پڑا۔ چونکہ ان کے والد گورنمنٹ کے ملازم تھے اس لیے ان کے اکثر تبادلے ہوتے رہتے تھے' چنانچہ 1965ء میں جب ان کا تبادلہ کوئٹہ میں ہوا۔ شبیر شہید کو سینٹ فرانسس گرائمر سکول کوئٹہ میں داخل کرا دیا گیا اور 1959ء میں جب ان کے والد لاہور آ گئے تو سینٹ انتھونی سکول لاہور ان کی درسگاہ بن گیا جہاں

سے انہوں نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے ہوئے انہیں ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ وہ فوج میں کیڈٹ کے طور پر بھرتی ہو گئے۔ 1964ء میں میجر شبیر شریف کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن ملا اور اس کے پانچ سال بعد 1965ء میں ان کی شادی ایور شائن پینٹس کے ڈائریکٹر میاں محمد افضل کی صاحبزادی روبینہ سے کر دی گئی جو پڑھی لکھی خاتون ہیں اور ہوم اکنامکس میں بی ایس سی پاس ہیں۔ ان کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ میجر شبیر شہید نے جس کا نام اپنے والد کے نام کی مناسبت سے تیمور شریف رکھا۔

سیرت و کردار

کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں اور لمبی مونچھوں والے میجر شبیر شہید کا قد درمیانہ اور جسم کسرتی تھا۔ آواز میں بلا کی گرج اور رعب تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسا سحر تھا کہ ہر کوئی مرعوب ہو جاتا۔ بچپن ہی سے انہیں صحت کی قدر و منزلت کا پورا احساس تھا، اس لیے باڈی بلڈنگ ان کا محبوب مشغلہ بنا رہا۔ خطروں سے کھیلنا ان کی عادت تھی اور ایسے کام جن میں محنت درکار ہوتی یا کوئی خطرہ لاحق ہوتا، اسے ضرور کرتے۔ طبعاً مہم جو اور جنگ جو تھے۔ بالخصوص موٹر سائیکل کی سواری میں وہ اپنی مثال آپ تھے اور اپنے علاقے کے ہیرو مانے جاتے تھے۔ ایک بار سیالکوٹ سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے سیالکوٹ تک اپنی موٹر سائیکل پر سفر کیا۔ اگرچہ انہیں ریل کے سفر کی سہولیات بھی میسر تھیں لیکن طبیعت میں جو مشکل پسندی تھی اس کی بناء پر وہ اکثر ایسا رسک لے لیا کرتے تھے۔

میجر شبیر شہید بچپن ہی سے حیرت کی حد تک ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ان کی معلومات دوسروں کو متاثر کرتی تھیں۔ ایک بار ان کے والد میجر محمد شریف جب کوئٹہ سے تبدیل ہو کر لاہور آئے تو ان کے داخلے کا مسئلہ درپیش تھا۔ شبیر شہید کو جس سکول میں داخلہ لینا تھا وہاں کوئی سیٹ خالی نہ تھی اور داخلہ بند ہو چکا تھا۔ ان کے والد نے ہیڈ ماسٹر سے بہت اصرار کیا لیکن وہ لیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ میجر شبیر کے والد کو اپنے بیٹے کی قابلیت و ذہانت پر ناز تھا، اس لیے انہوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ان

کا امتحان لینے کا مشورہ دیا، چنانچہ ہیڈ ماسٹر اس شرط پر رضامند ہو گئے کہ ان کا ٹیسٹ پوری کلاس کے سامنے لیا جائے گا۔ شبیر شہید کو سینئر کیمبرج کلاس کے تمام طالب علموں کے سامنے لے جایا گیا اور ہر بچے سے ایک سوال پوچھنے کو کہا گیا، چنانچہ کلاس کے تمام بچوں نے ایک سوال کیا اور میجر شبیر شہید نے ہر سوال کا صحیح اور تسلی بخش جواب دیا۔ یہ دیکھ کر ہیڈ ماسٹر اور مذکورہ کلاس کے ٹیچر انچارج دنگ رہ گئے۔ اس کے بعد میجر شبیر نے کلاس سے سوال پوچھے لیکن کوئی بھی ان کے سوالوں کا صحیح جواب نہ دے سکا۔ میجر شبیر شریف کی اس غیر معمولی ذہانت اور لیاقت سے متاثر ہو کر ان کے داخلے کا خصوصی بندوبست کیا گیا اور وہ سکول کے مایہ ناز طالب علم ثابت ہوئے۔

یوں تو میجر شبیر تعلیمی میدان میں اپنے تمام دوستوں سے آگے تھے لیکن کھیل کا میدان ان کی برتری کا ہمیشہ گواہ رہا۔ کرکٹ کا میچ ہو یا ہاکی کا مقابلہ، میجر شبیر شریف حرف آخر تھے۔ ان مقابلوں میں انہوں نے بے شمار انعامات حاصل کیے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ تقسیم انعامات کی تقریب میں زیادہ انعامات صرف شبیر شریف ہی کے حصے میں آتے بلکہ ایک بار تو ایسا ہوا کہ جلسہ تقسیم انعامات کی مہمان خصوصی نے جب بار بار شبیر شریف کو انعامات دیے تو ازراہ مذاق انہوں نے شبیر شریف سے کہہ ہی دیا کہ وہ کسی اور کے لیے بھی انعامات چھوڑ دیں۔

میجر شبیر شریف نے ایک مذہبی گھرانے میں جنم لیا تھا۔ مذہب کی محبت ان کی رگ رگ میں سما چکی تھی۔ شروع ہی سے وہ اپنے بزرگوں کے بہت زیادہ مطیع اور تابع فرماں تھے۔ کسی کو بھی ان سے کبھی کوئی شکایت نہ پہنچی تھی۔ انتہائی خوش و خرم اور با اخلاق انسان تھے۔ بے حد مہمان نواز تھے اور دوستوں کے معاملے میں بہت جذباتی واقع ہوئے تھے۔ بے شمار دوست ایسے تھے جن کو کپڑوں سے لے کر ضروریات زندگی کے لیے پیسے تک دے دیا کرتے تھے۔ اکثر تنخواہ کا زیادہ حصہ دوستوں کی نذر ہو جاتا۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی سے قرضہ تک نہ مانگا۔ منشیات سے سخت متنفر تھے، البتہ اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ ضرور پیتے تھے لیکن سگریٹ نوشی میں بھی بڑے محتاط رہتے اور ساری عمر اپنے والد اور سسر کے سامنے سگریٹ نہ پیا۔ دوستوں کی جان تھے اور ان کے بغیر ان کا جینا محال تھا۔ جب چھٹی پر گھر آتے تو رات گئے تک دوستوں کے

ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہتے اور دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔

میجر شبیر شہید کے ایک دوست تنویر کا انتقال ان کی شہادت سے تین ماہ قبل ہو گیا تھا۔ اپنے دوست کی موت پر شبیر شہید بہت دن اداس رہے تھے اور شاید یہ اسی محبت کا اظہار تھا کہ انہوں نے شہادت سے پہلے یہ وصیت کر دی تھی کہ انہیں دوست کے پہلو میں دفن کیا جائے چنانچہ ان کی اسی وصیت کے مطابق انہیں تنویر مرحوم کے پہلو میں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ میجر شبیر شہادت سے پہلے جب بھی چھٹی پر گھر آتے اپنی بیگم کے ہمراہ اپنے مرحوم دوست کی قبر پر فاتحہ خوانی اور پھول چڑھانے ضرور جاتے۔

میجر شبیر شہید کی گھریلو زندگی بہت خوشگوار اور مثالی تھی۔ ان کی دو سالہ ازدواجی زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ گزرا جو تلخ اور پریشان کن ہو۔ گھر سکھ چین اور خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ اپنی بیوی سے انہیں بے حد پیار تھا۔ ہمیشہ اس کی خوشیوں کا خیال رکھتے۔ اپنی مختصر ازدواجی زندگی میں وہ ہمیشہ ایک مخلص اور ہمدرد دوست کی طرح پیش آئے اور کبھی کوئی ایسی بات نہ ہونے دی جو ان کی بیوی یا گھر کے کسی دوسرے فرد کی دل شکنی کا باعث ہو۔

میجر شبیر شریف کو اپنے بہن بھائیوں سے بہت پیار تھا۔ ان کے بہن بھائیوں کو ان کے حسن سلوک کے بہت سے واقعات یاد ہیں۔ شبیر شریف خاص طور پر اپنے چھوٹے بھائی راحیل شریف میں اچھے اوصاف دیکھنے کے خواہاں تھے اور اکثر اسے نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے وعدے کے بہت پکے تھے جو وعدہ کر لیتے اسے ہر قیمت پر نبھاتے۔ وطن کی حفاظت کا انہوں نے جو وعدہ کیا تھا' اسے نبھاتے ہوئے انہوں نے اپنی جان تک قربان کر دی اور ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک وعدوں کی اتنی اہمیت ہے۔

فوجی خدمات

میجر شبیر شریف کی تربیت شروع ہی سے اس انداز سے ہوئی تھی کہ ان میں سپاہیانہ صلاحیتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ خاندان کے چونکہ بیشتر افراد فوج میں ملازم تھے'

اس لیے فوج میں جانا نہ صرف ان کا نصب العین بن چکا تھا بلکہ وہ اس وقت کے لیے بے چینی سے منتظر تھے جب وہ اپنے فوجی بھائیوں کے دوش بدوش دشمن کے خلاف صف آراء ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سینئر کیمبرج کرنے کے بعد جب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ فوج میں کیڈٹ بھرتی ہو گئے اور 19 اپریل 1964ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن حاصل کیا۔ اس وقت انہیں نمبر 6 ایف ایف رجمنٹ میں متعین کیا گیا۔ میجر راجہ عزیز بھٹی کے بعد وہ دوسرے نشان حیدر تھے جنہوں نے پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر Sword of honour شمشیر اعزازی حاصل کی۔

میجر شبیر شریف کمیشن ملتے ہی تندہی سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں منہمک ہو گئے اور ایک قلیل مدت میں فوج کے مختلف کورس بڑے اعزاز سے پاس کیے۔ ان میں "ویپنز کورس" (weapons course) "انٹیلی جنس کورس" (Intelligence course) اور "پیراشوٹ کورس" (Parachutes courses) بالخصوص قابل ذکر ہیں جو انہوں نے بالترتیب یکم اکتوبر 1966ء' 14 ستمبر 1968ء اور 12 نومبر 1970ء کو پاس کیے۔ کمیشن کے بعد وہ آٹھ سال تک فوج میں مختلف حیثیتوں سے ملکی خدمات پر مامور رہے۔ اس دوران وہ پلاٹون کمانڈر' کمپنی کمانڈر' سگنل آفیسر اور ایڈجوٹنٹ رہے۔

ستمبر 1965ء میں جب ہندوستانی سامراج نے طاقت اور کثرت تعداد کے زعم میں پاکستان پر بغیر اعلان جنگ کے حملہ کر دیا تو ہمارے فوجی جوان امن کے اس قاتل اور غارت گر کو درس عبرت سکھانے کو کمر بستہ ہو گئے۔ انہی نوجوانوں میں ایک میجر شبیر شہید بھی تھے جو اس وقت سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ اس وقت ان کو ایک کمپنی کا افسر بنا کر کشمیر بھیجا گیا۔ نمبر 6 ایف ایف کے بشیر احمد ملک جو میجر شبیر کے ماتحت تھے جنگ ستمبر 65ء کی روداد بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"1965ء کی جنگ کے دوران ہماری یونٹ بھی محاذ کی طرف چلی۔ راستے میں ایک جگہ سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر شریف کو حادثہ پیش آ گیا جو اس وقت جیپ میں سوار تھے۔ وہ معمولی سے

زخمی ہوئے۔ یکم ستمبر 1965ء کو حملہ آور بھارتی فوجوں سے نبرد آزما ہونے کی غرض سے آزاد کشمیر کی طرف پیش قدمی کی۔ اس وقت سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر کمپنی آفسر تھے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمارے شامل حال تھی اور ہماری یونٹ منادر اور چھمب کو روندتے ہوئے 4 ستمبر کو جوڑیاں سے کچھ فاصلے پر پہنچ گئی۔ جوڑیاں کے مقام پر ہندوستانی فوج کا ایک مضبوط مورچہ ہے۔ 4 ستمبر کو صبح دس بجے جوڑیاں پر ہماری پیش قدمی شروع ہوئی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر شریف نے بڑی جواں مردی اور ثابت قدمی سے دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔ ایک بار تو وہ دشمن کے مورچوں پر ٹوٹ پڑے مگر انہوں نے فوراً قلعے کے گیٹ سے اندر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قلعے کے گیٹ پر پہنچے اور وہاں کھڑے ہوئے سنتری کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی لوہے کی ٹوپی خود پہن کر بآسانی قلعے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ قلعے کے اندر انہیں ایک گاڑی جس پر پچیس پونڈ گولہ پھینکنے والی توپ نصب تھی ہاتھ لگی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر شریف اس گاڑی کو اپنی پوزیشن تک لے آئے۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر شریف دشمن سے ایک جھڑپ میں شدید زخمی ہو گئے اور انہیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہ محاذ پر جانے کے لیے اصرار کر رہے تھے، اس لیے ہسپتال والوں نے انہیں زیادہ وقت بے ہوش رکھا تاکہ ان کا خاطر خواہ علاج ہو سکے۔ آخر یہ عظیم مجاہد چار دن ہسپتال رہنے کے بعد پٹی سے بازو گلے میں لٹکائے پھر محاذ پر پہنچ گئے اور اپنی جواں مردی کا مثالی ثبوت دیا۔ انہیں اس محاذ پر ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔"

ان کے ماتحت بشیر احمد کلرک کے ان الفاظ سے میجر شبیر شریف کے عزم و استقلال کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی دلیرانہ قیادت سے دشمن کو ناقابل

تلافی نقصان پہنچایا۔ بلاشبہ وہ پہلے سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے جنہیں ایک کمپنی کی کمان سپرد کی گئی تھی۔ اس شاندار جرأت آموزی اور بہادری پر انہیں ستارۂ جرأت کے علاوہ "تمغہ جنگ" اور "تمغہ دفاع" بھی دیا گیا۔

بھارت نے اس محاذ سے ہزیمت اٹھانے کے بعد ٹینکوں کی یلغار سے چونڈہ کے محاذ کو تاریخی محاذ بنا دیا جہاں دنیا کی سب سے بڑی ٹینکوں کی جنگ ہوئی۔ شبیر شریف کو اس محاذ پر ایک کمپنی کی کمانڈ سونپی گئی جہاں انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے حالات پر قابو پائے رکھا اور اس لڑائی کے اختتام پر انہیں کیپٹن بنا دیا گیا۔ اکتوبر 1966ء کو انہیں ترقی دے کر ایڈ جوٹنٹ بنا دیا گیا۔ بعد ازاں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں کیڈٹوں کے انسٹرکٹر مقرر ہوئے اور یہیں ترقی کرتے ہوئے میجر کے عہدے پر ترقی کر گئے۔

بحیثیت انسٹرکٹر انہوں نے بہت اچھا مقام پیدا کیا تھا۔ اپنے کیڈٹوں میں ان کا ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد وہاں کے کیڈٹوں نے شدید اداسی محسوس کی۔ ان کے لیکچر دینے کا انداز دوسروں سے قطعی جدا تھا۔ گرج دار اور بارعب آواز کے باوجود حلاوت و شیرینی کا احساس ہوتا تھا۔ لہجہ کی شفقت اور الفاظ کا مناسب استعمال ان سب پر انہیں خاصا عبور حاصل تھا۔"

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد وہ نمبر 6 ایف ایف میں انفنٹری بٹالین کے کمپنی کمانڈر بن گئے۔

معرکہ گور مکھیڑہ

اہنسا کے پجاری بھارتی سامراج نے اپنے زر خرید ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا لیکن پاکستانی مجاہدوں نے انتہائی ناساعد حالات کے باوجود نہ صرف اسے منہ توڑ جواب دیا بلکہ وطن عزیز کی حفاظت میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں مسلسل بارہ روز کی شرمناک پٹائی کے بعد بھارتی عفریت کے اس پھنکارتے ہوئے ناگ نے مغربی پاکستان کا رخ کر لیا اور 3 دسمبر 1971ء کو مغربی پاکستان کی سرزمین میدان کارزار بن گئی۔ اس حملے کی خبر جب میجر شبیر شریف کو ہوئی تو ان کے تن من میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے ستمبر 1965ء میں جس دشمن کا

سر کچلا تھا' وہ آج پھر سر اٹھا رہا تھا اور میجر شبیر شریف اس کے اٹھتے ہوئے سر کو کچلنے کے لیے بے قرار تھے۔ بھارتی حملے کی اطلاع پاتے ہی وہ اپنے کمانڈر کے پاس پہنچے اور دشمن کو نیست و نابود کرنے کی اجازت چاہی۔ کمانڈر نے جب دیکھا کہ وہ محاذ پر جانے کے لیے بہت بے قرار ہیں تو وہ ان کے جذبہ اور ولولہ انگیز ارادوں سے بہت متاثر ہوئے لیکن کمک نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے میجر شبیر کو اس ارادے سے باز رکھا اور سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"میرے بیٹے! دشمن نہ صرف طاقت میں ہم سے زیادہ ہے بلکہ بہت زیادہ عیار و مکار اور بے اصول ہے۔ اس کی مورچہ بندی بہت مضبوط ہے اور پھر اس نے پورے علاقے میں بارودی سرنگوں کا ایک جال سا بچھا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ٹینکوں اور توپوں کی بھی بھرمار ہے۔ بہتر ہے کہ تم کمک کے آنے کا انتظار کرو۔"

میجر شبیر شریف نے جب اپنے معزز کمانڈر کی یہ باتیں سنیں تو ان کا جذبۂ شہادت اور بڑھ گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک مسلمان ہیں اور فوج و اسلحہ کی کثرت سے کہیں بڑھ کر اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ کمانڈر نے جب میجر صاحب کا اصرار بڑھتے ہوئے دیکھا تو انہیں روکنا مناسب نہ جانا اور پیش قدمی کی اجازت دے دی۔ اس اجازت کے ملتے ہی میجر شبیر شریف کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور وہ سلیمانکی سیکٹر کی جانب چل دیئے۔

میجر شبیر شریف سلیمانکی ہیڈورکس کے راستے دشمن کو کچلنے کے لیے الف الف رجمنٹ کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کی منزل مقصود گورمکھیڑہ اور بیری والا گاؤں سے ملتا ہوا ایک اونچا بند تھا۔ فوجی لحاظ سے اس جگہ کی بڑی اہمیت تھی جس کا دفاع بھارتی فوج کی آسام رجمنٹ کی ایک کمپنی سے زائد نفری کر رہی تھی اور اسے نمبر 18 کیواری کے ٹینکوں کے ایک سکویڈرن کی مدد بھی حاصل تھی۔

3 دسمبر 1971ء کو جب دشمن نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کر دیا تو میجر شبیر شریف کو پیش قدمی کرنے اور بڑھتے ہوئے دشمن کو اسی کے علاقے میں دھکیل

دینے کے احکامات ملے۔ میجر شبیر شریف تو پہلے ہی دشمن سے پنجہ آزمائی کرنے کو بے تاب تھے چنانچہ اس حکم کے ملتے ہی وہ دشمن پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کو اس جوابی کارروائی کی قطعی امید نہ تھی' لہٰذا وہ اتنا ہراساں ہوا کہ اسے بھاگتے ہی بنی۔

میجر شبیر شریف کو منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے راستے میں موجود ایک بھارتی چوکی "جھانگر" کو تہس نہس کرنا تھا اور بارودی سرنگوں سے اٹے پڑے علاقے کو پار کر کے دشمن کی دفاعی نہر سوربونا (Surbuna) (تیس فٹ چوڑی اور دس فٹ گہری) کو کراس کرنا تھا۔ یہ نہر گورمکھیڑہ کے اونچے بند کے قریب واقع تھی۔

اس اہم چوکی پر قبضہ کرنا اور اسے دشمن سے خالی کرانا کوئی آسان کام نہ تھا جبکہ دشمن ہر طرح سے مسلح اور چوکس تھا' مگر میجر شبیر شریف تو شروع ہی سے مہم جو اور خطروں سے کھیلنے کے عادی تھے۔ وہ اللہ کا نام لے کر اپنے جیالے اور صف شکن ساتھیوں کے ہمراہ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے کمال ہوشیاری' جرأت اور استقلال سے اپنی کمپنی کی قیادت کی اور "جھانگر" کی وہ چوکی جو دشمن کی آخری امید گاہ تھی' مسلمانوں کے قبضے آ گئی۔ اس کے بعد مجاہدین جان کی پروا کیے بغیر بارودی سرنگوں کے علاقے سے گزر گئے اور دشمن کی اندھا دھند فائرنگ کے باوجود اپنی پیش قدمی کو جاری رکھا اور دشمن کے علاقے میں دو میل اندر تک گھس گئے۔ اب دشمن کے لیے مجاہدین کا سامنا کرنا ناممکن ہو گیا تھا اور وہ پسپائی پر مجبور تھا' بے بس ہو کر اس نے "گورمکھیڑہ" کی طرف بھاگنا شروع کر دیا لیکن مجاہدین کا تعاقب رہا۔

گورمکھیڑہ کی صورت حال قدرے پیچیدہ تھی کیونکہ ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہاں دشمن کی کافی فوج اور کثیر اسلحہ تھا "بیری والا" گاؤں میں میجر شبیر شریف نے وائرلیس پر اپنے کمانڈر سے رابطہ قائم کیا اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا جس کے جواب میں کمانڈر نے انہیں محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ اپنے کمانڈر سے بات چیت کے بعد میجر شبیر شریف نے اپنی کمپنی کے جوانوں سے ولولہ انگیز اور ایمان افروز خطاب کیا۔ انہوں نے مجاہدین کو اللہ پر بھروسہ رکھنے اور دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر ان میں سے کوئی پیچھے ہٹا تو وہ اسے گولی مار دیں گے اور اگر وہ پیچھے ہٹیں تو انہیں بھی شوٹ کر دیا جائے۔

میجر شبیر شریف کی اس دعوت پر مجاہدین نے تن من دھن لٹا دینے کا عزم ظاہر کیا اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی اور ساتھ ہی وہ اپنے مشن کی تکمیل کو چل نکلے اور پچیس منٹ کے اندر دشمن کی دفاعی نہر کے کنارے پہنچ گئے۔

دسمبر کی رات' سخت سردی اور نہر کا ٹھنڈا پانی' لیکن نہر کو ہر قیمت پر عبور کرنے کا عزم ہر تکلیف پر غالب آ گیا۔ نہر کے اونچے بند کے قریب دشمن نے اپنی بھاری توپ خانے کا خودکار ہتھیاروں کے فائر کا مکمل انتظام کیا ہوا تھا اور جب یہ مٹھی بھر جیالے نہر پار کرنے لگے تو دشمن نے چاروں طرف سے فائر کھول دیئے۔ ایک عجیب منظر تھا جس کی مثال تاریخ میں شاید کہیں اور نہ مل سکے۔ یخ بستہ پانی میں تیرتے ہوئے مجاہدین' ایک ہاتھ میں بندوق تھامے اور پانی کے اثرات سے بچانے کے لیے ہاتھ کو بلند کیے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے نہر پار کرنے لگے۔ دشمن کے گولے ان کے چاروں طرف گر رہے تھے لیکن وہ ان پٹاخوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے گئے اور نہر کو پار کر گئے۔

نہر کے دوسرے کنارے پر دشمن کی فوجیں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ جونہی مجاہدین نہر پار کر کے دشمن کے قریب پہنچے تو ان کا غصہ اور شدت اختیار کر گیا اور دشمن پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے ایک شیر اپنے شکار کو دبوچتا ہے۔ کچھ دیر تک دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ مجاہدین نے دشمن کے تمام کس بل نکال دیئے اور اسے بھگا کر اس کے کنکریٹ کے مضبوط مورچے پر قبضہ کر لیا۔ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ مسلمانوں کے مٹھی بھر مجاہدین نے ایک پوری کمپنی سے گتھم گتھا ہو کر اسے کیونکر مغلوب کر لیا لیکن یہ عشق کی منزل تھی جہاں عقل کو بالائے طاق رکھ کر آگ میں کود جایا کرتے ہیں۔

اب تک میجر شبیر شریف کا مشن پوری طرح کامیابی سے ہمکنار تھا۔ دشمن کے تینتالیس مردار جہنم واصل ہوئے اور اٹھائیس کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس کے علاوہ چار ٹینک' تباہ کر دیئے گئے اور بے شمار اسلحہ اور بارود قبضے میں آ گیا جسے مجاہدین دشمن ہی کے خلاف استعمال کرنے کے خواہش مند تھے۔ دشمن نے مجاہدین کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اونچا بند غازیوں کے قدموں تلے آ کر رہ گیا اور بند پر قبضہ ہوتے ہی وہ

پل بھی قبضے میں آ گیا جو گور مکھیڑہ کو جانے والا ایک ہی راستہ تھا۔

دشمن بھی ایسی ذلت آمیز شکست کے بعد کیسے چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی تازہ دم فوج آ گئی اور اس نے پے در پے کئی حملے کیے۔ 3 اور 4 دسمبر کی رات دشمنوں کے حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے بسر ہوئی۔ مکار دشمن اپنی خفت مٹانے کو بار بار حملہ آور ہو رہا تھا مگر پاکستان کے مجاہدین اپنے باہوش کمانڈر میجر شبیر شریف کی قیادت میں اسے منہ توڑ جواب دے رہے تھے۔ پاک فوج کے مٹھی بھر جوانوں سے دوہری شکست کھانے کے بعد دشمن بپھر اٹھا اور دیوانہ وار حملے کرنے لگا۔ ایک بار تو اس نے بالکل نئی کمک منگوا کر پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ عموماً چونڈہ کی جنگ کو خوفناک ترین جنگ کہا جاتا ہے لیکن گور مکھیڑہ کا یہ معرکہ بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بلکہ چونڈہ کے محاذ میں تو پاک فوج کے بھی ٹینک اور خودکار ہتھیار مصروف عمل تھے لیکن گور مکھیڑہ میں دشمن کے ٹینکوں کے سامنے گوشت پوست کے یہ مجاہد ہی سینہ سپر تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ دشمن کے پاس خودکار توپیں' اوپر سے جہازوں کے ذریعے بمباری' آگے دشمن اور پیچھے گہری نہر' سخت جنگ ہوئی۔ مجاہدین نے شوق شہادت میں بڑھ بڑھ کر دشمن کے حملوں کا جواب دیا اور اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس کسمپرسی' اسلحہ کی تخفیف اور کئی روز کی مسلسل بے آرامی اور تھکاوٹ کے باوجود مجاہدین دشمن کے سامنے ناقابل تسخیر چٹان بنے رہے' جس سے ٹکرا کر دشمن خود ہی پاش پاش ہوتا رہا اور مجاہدین اس پر چھائے رہے۔ اس وقت وہ شہادت سے مطلوب و مقصود مومن' کی صحیح تصویر بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے دل کی یہی خواہش تھی کہ وہ وطن کی آن پر مر مٹے۔ چند مجاہدین تو اپنی اس خواہش میں کامیاب بھی ہو گئے اور جام شہادت سے فیض یاب ہوئے۔

کئی حملوں میں مسلسل ہزیمت اٹھانے کے بعد دشمن نے ایک فیصلہ کن حملے کی ٹھان لی۔ ایک حملے کے دوران تو میجر شبیر شریف نے انتہائی جرأت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے مورچے سے جست لگا کر بھارتی فوج کے جاٹ رجمنٹ کے کمانڈر میجر نرائن سنگھ کو دبوچ لیا اور اسے اسی کے اسٹین گن سے ہلاک کر کے چند اہم دستاویز کو قابو کر لیا۔ ادھر دشمن بار بار کی ناکامی کے بعد حواس باختہ ہو کر دیوانہ ہو

گیا تھا۔ چنانچہ 6 دسمبر کو اس نے جو حملہ کیا وہ سب سے خوفناک تھا۔ اس حملے میں اس نے تیسری آسام رجمنٹ اور چوتھی جاٹ رجمنٹ کی دو بٹالین کے علاوہ نمبر 18 کیولری کے ٹینکوں کی امداد بھی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی فضائیہ کو بھی میدان کارزار میں جھونک دیا۔ دشمن کی آگ برساتی توپوں اور ٹینکوں نے ہر طرف قیامت برپا کر رکھی تھی۔ پاک فوج کے مٹھی بھر جوان اس کے قیامت خیز حملوں کے سامنے آہنی دیوار بنے ہوئے تھے اور دشمن اپنے جنون میں دیوانہ وار حملے کر رہا تھا۔ میجر شبیر شریف نے جب دشمن کے حملوں میں زور دیکھا تو ایک توپچی کی جگہ خود سنبھال لی اور دشمن پر کئی حملے کر کے اس کے کئی ٹینکوں کے پرخچے اڑا دیے۔ وہ اپنے اس فرائض کی ادائیگی میں تندہی سے مصروف عمل تھے کہ ایک گولہ سامنے سے آیا اور ان کا سینہ چیرتے ہوئے نکل گیا۔ میجر شبیر شریف نے اپنے نصب العین کو پا لیا تھا۔ موت کے نرم و گداز ہاتھ تین دن سے تھکے ماندے اس شہید کو اپنی آغوش میں لینے کو بڑھ رہے تھے۔ میجر شبیر شریف نے اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوتے ہوئے انہیں لڑکھڑاتی آواز میں دشمن کے خلاف ڈٹے رہنے اور وطن عزیز کی حفاظت کا پیغام دیا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

میجر شبیر شہید کے ساتھیوں نے جب اپنے قائد کو جدا ہوتے ہوئے دیکھا تو بپھرے شیروں کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر مورچوں سے باہر نکل آئے اور دشمن سے دست بدست لڑنے لگے۔ دشمن مجاہدین کی ان کاری ضربوں اور حملوں سے اتنا بوکھلایا کہ اپنے ہی جوانوں کی لاشوں کو روندتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ گورمکھیڑہ کا میدان لاشوں سے بھرا پڑا تھا اور دور کھڑا دشمن شبیر شہید کے شیروں کو سہمی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جو گورمکھیڑہ کے فاتح تھے۔

تاثرات

میجر شبیر شریف کی شہادت کی اطلاع جب ان کے گھر پہنچی تو ان کے گھر والوں کی عجیب کیفیت تھی۔ جہاں شبیر شہید کے اتنے بڑے کارنامہ پر فخر و انبساط محسوس کر رہے تھے وہاں ان کی جدائی بھی بے کلی کا باعث بن رہی تھی۔ شہید کے والد

میجر شریف نے گھمبیر لہجے میں کہا:

"مجھے اپنے شہید بیٹے پر فخر ہے کہ وہ نہایت بہادری سے لڑا اور پاک فوج کی شاندار روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان پر پورا اترا۔"

شہید کی والدہ نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا:

"مجھے علم تھا کہ میرا بیٹا اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے گا اسی لیے میں نے اس کا نام "شبیر" رکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

شہید کی بیوہ مسز زوبینہ نے اپنے شوہر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

"میں اپنے شوہر کی جدائی کو اگرچہ ناقابل برداشت سمجھتی ہوں لیکن انہوں نے جس مقصد کے لیے اپنی جان دی ہے وہ نہایت عظیم ہے۔ مجھے ان کے اس کارنامے پر فخر ہے۔ وہ ایک بہادر انسان تھے اور شہید ہونا ان کی خواہش تھی۔ وہ مجھے بھی بہادری کا سبق دیا کرتے تھے۔ محاذ سے جوان کا آخری خط آیا اس میں انہوں نے لکھا تھا—

"میں اسلام اور اسلامیان پاکستان کی خاطر جان کی بازی لگانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ ہندوستان کا غلام بنوں۔ ہم نے جان توڑ کر لڑنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ ہم دشمن کا اپنی سرحدوں پر اپنی گلیوں اور مکانوں میں ڈٹ کر مقابلہ کریں گے لیکن ہار نہ مانیں گے۔ ہمیں دشمن کا غلام بننے کی بجائے مر جانا پسند ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کو اللہ کا سہارا ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ ہم قدم قدم پر دشمن کا مقابلہ کریں گے اور ایک انچ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بہادرانہ انداز میں خط لکھا کرو کیونکہ تم ایک سپاہی کی بیوی ہو۔"

لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں نے اپنے ایک پیغام میں شہید کو یوں خراج تحسین پیش کیا:

"میجر شبیر شریف نے پاکستان کی عظمت و وقار اور سالمیت کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کی ہے اور یہ ان کی عظیم قربانی اسلام اور پاکستان کے لیے سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔ پوری فوج کو ان پر فخر ہے۔"

ایک خط میں لکھا:

"میں شبیر کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے اور پی ایم اے سے انہوں نے شمشیر اعزاز حاصل کی تھی۔ حقیقت میں وہ ایک اعلیٰ افسر تھے جن کا مستقبل درخشاں نظر آتا تھا۔ میں ان کی ترقی کی رفتار کو باقاعدگی کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ چند ماہ قبل وہ جب مجھ سے ملے تو بہت چاک و چوبند دکھائی دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی کارنامہ انجام دینے والے ہیں۔"

لیفٹیننٹ کرنل امام علی میجر شبیر شریف کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ شہید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"شہید بہت بڑے سپاہی تھے اور انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ انہیں اپنے وطن سے سچا پیار تھا۔ اگرچہ ان کی قربانی سے ہمیں قومی نقصان پہنچا ہے۔ دوران جنگ انہوں نے معجزانہ کارنامے انجام دیئے اور ہندوستان کی ایسی چوکیوں پر قبضہ کیا جو بہت مشکل تھا۔ انہوں نے اس پر بس نہ کیا بلکہ مسلسل پیش قدمی کرتے گئے۔"

میجر آئی آر صدیقی اے ای سی نے میجر شبیر شریف کے بارے میں لکھا ہے:

"میجر شبیر شریف جنہیں قوم نے نشان حیدر نذر کیا ہے' اس سے پہلے 1965ء کی جنگ میں چھمب جوڑیاں کے محاذ پر ستارۂ جرأت بن کر چکے تھے۔ 1971ء کی جنگ میں سلیمانکی فاضلکا سیکٹر میں ان کا کارنامہ ایک طرف بے مثال جرأت و بہادری کی داستان

ہے تو دوسری طرف جنگی کامیابی کی نادر مثال۔ یوں تو ہر صاحب ایمان سپاہی کا نعرہ ہوتا ہے "غازی یا شہید" مگر سلیمانکی سیکٹر کے اس جواں سال جانباز کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ غازی ہے اور شہید بھی۔ وہ نہ صرف دشمن کے خلاف (اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ) سیسہ پلائی دیوار بن گیا بلکہ دشمن کو اسی کی سرزمین پر دھکیلا اور اس حد تک دھکیلا گیا کہ دشمن کے علاقے کے میلوں اندر اس کی دوسری دفاعی لائن کے مضبوط ترین مورچوں کو اس سے چھین لیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شبیر نے اپنے وطن کی عظمت کا جھنڈا گاڑا۔ اسی مقام پر شبیر نے اپنی شجاعت کا لازوال نقش ثبت کیا۔ اتنی عظیم بلندیوں پر پہنچ کر شاید شبیر نے اور اونچا۔۔۔ بہت اونچا جانا پسند کیا۔ یا خود قدرت کو اس جانباز کی شبیری پر اتنا پیار آیا کہ اسے پاس ہی بلا لیا اور یوں شبیر کی شہادت کا رتبۂ عظیم ملا جو مومن کا حقیقی مطلوب و مقصود ہے۔ اور جس کی آرزو لیے بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ساتواں نشان حیدر

سوار محمد حسین شہید

ایک نو عمر طالب اپنے ہم جماعت کے ہمراہ سکول سے واپس آرہا تھا۔ یکایک فضا میں گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور دو جیٹ طیارے تیز رفتاری سے پرواز کرتے ہوئے گزر گئے۔ نو عمر طالب علم کچھ دیر تک مبہوت کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھی طالب علم نے دیکھا اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے اور وہ کچھ سوچ رہا ہے ابھی وہ اس سے پوچھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے بڑی حسرت سے لیکن پرجوش لہجے میں کہا:

"کاش میں ان کو تباہ کر سکتا۔"

سکول سے واپس آنے اور جہازوں کو تباہ کرنے کا خواہش مند طالب علم محمد حسین تھا اور یہ واقعہ 1965ء کی جنگ کا ہے جبکہ سوار محمد حسین شہید ابھی صرف طالب علم تھے لیکن فوج میں بھرتی ہونے اور وطن عزیز کے دفاع کے لیے سینہ سپر ہونے کی آرزو لیے ہوئے تھا بالآخر اپنی اس خواہش کی تکمیل کو پہنچ گئے اور نہ صرف وطن عزیز کے دفاع میں جان قربان کی بلکہ عزم و ہمت اور شجاعت و مردانگی کی وہ مثال پیش کی جسے اپنے سینے پر سجانے کے لیے تاریخ کے اوراق ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

محمد شہید نے اپنی عظیم قربانی کی بناء پر "نشان حیدر" کا اعزاز پایا اور اس لحاظ سے وہ دوسروں سے منفرد ہیں کہ اس سے قبل "نشان حیدر" کا اعزاز صرف آفیسرز کو نصیب ہوا تھا لیکن محمد حسین شہید نے سپاہی کی حیثیت میں تحمل آمیز جرأت، دماغی یک سوئی اور فرض شناسی کے ساتھ بہادری کا یہ کارنامہ سرانجام دے کر "نشان حیدر"



سوار محمد حسین شہید نشانِ حیدر

کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ سرکاری تذکرہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"اس طرح وہ 10 دسمبر 1971ء کو جان قربان کرنے سے قبل ہی ایک تاریخی کردار اور بہادری کے پیکر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ بہادر تھا اور اس میں جذبۂ جہاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ عام موٹر گاڑیوں (Soft Vehicles) کا ڈرائیور تھا لیکن مادرِ وطن کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ گھمسان کی جنگ میں کود گیا۔"

سوار محمد حسین شہید کا تعلق راجپوت جنجوعہ خاندان سے تھا۔ ان کے والد روز علی ایک معمولی سے زمیندار ہیں اور اپنے کنبہ کے علاوہ اپنے مرحوم بھائی کی کفالت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کا خاندان عرصہ سے ڈھوک پیر بخش میں آباد ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں اور گاؤں کے تمام لوگ شہید کے رشتہ دار ہیں۔ مندرہ سے تقریباً 12 میل کے فاصلے پر یہ گاؤں آباد ہے۔ ضلع جہلم اور گجرات کو شروع ہی سے یہ اعزاز رہا ہے کہ انہوں نے بہادر سپوتوں کو جنم دیا ہے اور فوج کی اکثریت انہی اضلاع سے متعلق ہے اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ یہاں کا ہر باشندہ فطری طور پر جفاکش، محنتی اور سپاہیانہ انداز کا مالک ہوتا ہے۔ سوار محمد حسین شہید کے خاندان کے بیشتر افراد فوجی ملازمت میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں ان کے نانا حوالدار احمد خاں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں اعلیٰ خدمات کے عوض چار تمغے حاصل کیے۔ ان کے علاوہ ان کے ایک اور رشتہ دار شاہد خاں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران "وکٹوریہ کراس" حاصل کیا۔ الغرض ان کے خاندان کے کئی افراد اپنی اعلیٰ اور درخشاں روایات کے مطابق فوج میں شامل رہے ہیں اور اپنی خدمات کے اعتراف میں انعامات حاصل کئے ہیں۔

حالاتِ زندگی

سوار محمد حسین شہید کا گھرانہ ایک غریب لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال

گھرانا ہے جہاں عشقِ رسولؐ سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ خاندان کے افراد زیادہ پڑھے لکھے نہیں لیکن مذہبی احکامات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، اور زندگی کی حقیقتوں سے پوری طرح آشنا ہیں۔ اس گھرانے میں جا کر قرونِ اولیٰ کے ان مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اپنے اعمال اور روحانیت سے گردشِ لیل و نہار کا رخ بدل دیا کرتے تھے اور جن کے سامنے ایمان پرور کردار نے کئی باطلوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی گھرانے میں 18 جون 1948ء کو سوار محمد حسین شہید پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے انہیں گھر پر قرآن شریف پڑھایا گیا اور اس کے بعد موضع جھنگ پھیرو کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ یہاں سے پانچ جماعتیں پاس کر لینے کے بعد وہ دیوی ہائی سکول دیوی میں داخل ہو گئے اور کامیاب ہوتے ہوئے دسویں جماعت میں پہنچ گئے۔ بورڈ کی جانب سے میٹرک کے امتحان میں شامل ہوئے لیکن ایک مضمون میں فیل ہو گئے۔ اسی دوران 1965ء کی جنگ شروع ہو گئی۔ گھر والوں نے بہت اصرار کیا کہ وہ دوبارہ میٹرک کے امتحان میں شامل ہوں مگر وہ نہ مانے۔ 1966ء میں جاتلی کے مقام پر فوج کی عام بھرتی شروع ہو گئی۔ اس کی اطلاع جب سوار محمد حسین شہید کو پہنچی تو وہ اپنے ایک دوست دل پذیر کے ہمراہ ریکروٹنگ آفیسر کے سامنے جاتلی ریسٹ ہاؤس میں پیش ہوئے اور دونوں فوج کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ فوج میں بھرتی ہونے کی انہیں شروع ہی سے آرزو تھی چنانچہ یہ ملازمت ملتے ہی وہ خود کو ہر طرح سے مکمل سمجھنے لگے۔ ملازمت کے دو سال بعد ان کی شادی ان کی خالہ کی بیٹی مسماۃ ارزاں بی بی سے کر دی گئی جن کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑی بچی ہے جس کا نام رخسانہ ہے، چھوٹا بچہ ہے اور اس کا نام منور محمد ہے۔ یہ ذکر بہت تکلیف دہ ہے کہ محمد حسین شہید کو اپنے بیٹے کی آمد کی بہت آرزو تھی۔ لیکن وہ بچے کو دیکھ نہ سکا۔ جن دنوں ان کے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ان دنوں وہ سیالکوٹ میں متعین تھے۔ گھر والوں نے خط کے ذریعے ان کے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی۔ یہ خط جب ان کی یونٹ میں پہنچا تو ساری یونٹ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دوستوں نے مبارکباد کے ساتھ لڈوؤں کی فرمائش کی۔ محمد حسین شہید جو اس خبر پر پھولے نہیں سما رہے تھے لڈوؤں کی بجائے مرغ کھلانے کا وعدہ کیا اور حسب وعدہ چند مرغ خرید بھی لیے مگر اسی دوران ہندوستان نے بغیر کسی

اعلان کے پاکستان پر حملہ کرنا اور پاکستانی مجاہدوں کو اس کے دفاع کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑا۔

سوار محمد حسین شہید کی پارٹی ادھوری رہ گئی اور جنگ شروع ہو گئی۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ دشمن سے نبرد آزما تھے کہ ان کا وقت پورا ہو گیا اور وہ اپنے لخت جگر کو دیکھے بغیر وطن کی آن اور فرض کی پکار پر مر مٹے اور شہادت کے مرتبے کو پہنچے۔

سیرت و کردار

دراز قد، سڈول جسم، گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والے سوار محمد حسین شہید کی زندگی انتہائی سادہ تھی اور ان کا رہن سہن بالکل زمینداروں کا سا تھا۔ دودھ، دہی اور لسی کے بہت شوقین تھے۔ سبزیاں اور دالیں زیادہ پسند کرتے اور مرغن غذاؤں سے حتی المقدر اجتناب کرتے۔ گھر میں اکثر شلوار قمیض پہنتے۔ اسلام کی محبت اس کی گھٹی میں شامل کی گئی تھی۔ ان کے والد ایک درویش منش اور پیر پرست انسان ہیں۔ بزرگان دین سے انہیں بہت عقیدت ہے اور ان کا کہنا ہے کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے یہ سب بزرگان دین کا طفیل ہے، بالکل یہی خصوصیات ان کے بیٹے سوار محمد حسین شہید میں بھی تھیں۔ وہ بہت زیادہ شریف، ملنسار اور طبعاً حلیم تھے۔ خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ و دلدادہ تھا۔ چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ سی طاری رہتی جو ان کے قلبی اطمینان اور مسرت و شادمانی کی غمازی ہوا کرتی تھی۔ دوسروں سے ملتے ہوئے ادب آداب کے طریقوں کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ بزرگوں کا احترام کرتے اور بچوں کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ ساری زندگی میں کبھی کوئی شخص ان سے ناراض نہیں ہوا تھا۔

سوار محمد حسین کی گھریلو زندگی انتہائی خوشگوار اور دوسروں کے لیے مثالی تھی۔ ان کی چار سالہ ازدواجی زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جو باہمی رنجش و تلخی کی نظر ہو گیا ہو۔ اس کا سبب جہاں سوار محمد حسین کی متبسم شخصیت ہے۔ وہاں ان کی نیک پارسا اور صابر و شاکر بیوی کا بھی کردار ہے، جس نے دنیا کی ہر چیز پر اپنے شوہر کو فوقیت دی

اور اسے اپنا مجازی خدا جانتے ہوئے سب کچھ تیاگ دینے کو تیار تھی۔ شہید اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتے تھے اور اپنی محدود تنخواہ کے باوجود اس کی دلجوئی اور دلبستگی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اکثر بیوی کے مطالبے کے بغیر ہی اس کے لیے چیزیں خرید لاتے۔ ان کی بیوی کا بھی یہ عالم ہے وہ ایک مذہبی گھرانے کی تمام روایات پر پوری اترتی ہیں اور اسلام میں خواتین کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کی صحیح اور سچی تصویر ہیں۔

سوار محمد حسین شہید بہت نڈر، بہادر اور بے باک تھے۔ صاف گوئی ان کا طرہ امتیاز تھی۔ گفتگو کا انداز بہت پرکشش اور مسحور کن تھا۔ قدرت نے انہیں آواز بھی بہت سریلی عطا کی تھی۔ اکثر وہ دوستوں کو اپنے علاقائی گیت سنایا کرتے تھے۔ محرم الحرام کے دنوں میں واقعہ کربلا لہک لہک کر پڑھتے تو سامعین پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا۔ اسلامی تاریخ، بالخصوص اولیاء کرام کی سوانح حیات اور واقعہ کربلا عموماً ان کے زیر مطالعہ رہتے۔ اپنے مرشد سے انہیں بہت پیار تھا۔ گاؤں آتے یا واپس جاتے تو مرشد کی خدمت میں ضرور حاضری دیتے۔

شہید کو بچپن ہی سے جرأت اور ہمت کے علاوہ وطن کی محبت جیسی لازوال نعمتوں سے نوازا گیا تھا۔ ان کے زمانہ طالب علمی کے دوران جب پاک بھارت جنگ چھڑ گئی تو بڑی دلچسپی سے واقعات کو سنا کرتے تھے اور جب پاک فوج کی بہادری اور شجاعت کی خبریں موصول ہوتیں تو ان کا چہرہ دمک اٹھتا اور وہ نعرے لگانے لگتے۔ اسی طرح وہ جب فضا میں پاکستانی طیاروں کو پرواز کرتے ہوئے دیکھتے تو ان کے نعرہ تکبیر کی صدائیں دور دور تک جاتیں۔

شہید بہت مہمان نواز اور دوست پرست انسان تھے۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود وہ ہمہ وقت دوسروں کی امداد کے لیے تیار رہتے۔ ایک بار ان کی یونٹ کا ساتھی بیمار ہو گیا۔ شہید اس کی عیادت کے لیے جاتے تو ہمراہ پھل اور دودھ وغیرہ بھی لے جاتے۔ ان کے دوست نے ایک روز انہیں اس تکلف سے باز کرنا چاہا، لیکن شہید نہ مانے اور کہا یہ ان کا فرض ہے اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک دوست کا حق ہے۔ ان اوصاف کے علاوہ وہ حد درجہ ایماندار اور امانت دار تھے۔ امانت میں خیانت کرنا ان کے

نزدیک ناقابلِ معافی گناہ تھا۔ ساری زندگی امانتوں کے سلسلے میں وہ پورے اترے۔ ان کا ایک واقعہ آج بھی ان کے ساتھیوں کے لیے مثال بنا ہوا ہے۔

ایک بار ان کے کسی دوست نے دو سو روپے ان کے پاس امانت رکھ دیئے۔ اس دوران شہید کے والد نے ایک ضرورت بیان کی اور کچھ پیسوں کا مطالبہ کیا۔ شہید نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس دو سو روپے دوست کی امانت ہیں لیکن وہ اس میں کسی صورت بھی خیانت نہیں کریں گے البتہ پچاس روپے لے جا سکتے ہیں جو کہ ان کے ذاتی پیسے ہیں اور کسی کی امانت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور دو سو روپے محفوظ رکھ کر والد کو پچاس روپے دے دیئے۔

محمد حسین شہید نے ساری عمر کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو غیر شرعی کہلا سکے۔ نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ خود نیک کام کرتے اور اپنے دوستوں کو بھی ان کی تلقین کرتے۔ ساری عمر انہوں نے کسی نشہ آور چیز کو منہ تک نہ لگایا تھا۔ دوستوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ سکول کے زمانے میں کبڈی کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے بعد والی بال کھیلنے لگے اور جب فوج میں پہنچے تو باسکٹ بال کے بھی کھلاڑی بن گئے۔

شہید کو دوسروں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں شریک ہو کر بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کے علاقہ کی مسجد زیر تعمیر تھی چنانچہ ان کے والد نے خط کے ذریعے مسجد کے لیے چندہ منگوایا اتفاق سے اس وقت شہید کے پاس زیادہ پیسے نہ تھے جبکہ وہ مسجد کی تعمیر میں دوسروں سے بڑھ کر حصہ لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کو چند دنوں کے لیے روک دیا اور کہا کہ وہ کچھ دیر انتظار کریں۔ کیونکہ وہ اس نیک کام میں بہت زیادہ حصہ لینا چاہتے ہیں۔

الغرض شہید کی زندگی کے ایسے بے شمار واقعات ہیں جو دوسروں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیں گے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حقیقت شناس شاعر حضرت اقبال کے اس خیال کے ترجمان تھے۔

ع گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

فوجی ملازمت

1966ء میں جاتلی ریسٹ ہاؤس میں فوج کی عام بھرتی شروع ہوئی تو وہ اپنے ایک بچپن کے ساتھی دل پذیر کے ساتھ ریکروٹنگ آفیسر کے سامنے پیش ہوئے اور دونوں ہی منتخب کر لیے گئے۔ ابتدائی تربیت کے لیے انہیں پہلے نوشہرہ بھیجا گیا اس کے بعد انہیں سیالکوٹ بھیج دیا گیا اور آخر مدت تک وہ سیالکوٹ رہے۔ تربیت کے ضروری مراحل طے کرنے کے بعد وہ "آرمڈ کور" کی 20 لانسر سے بحیثیت ڈرائیور منسلک ہو گئے۔

ہرڑ خورد کا معرکہ

سوار محمد حسین شہید کو فوج میں شامل ہوئے پانچ سال گزرے تھے کہ ہندوستان نے پاکستان پر جنگ مسلط کر دی۔ 1971ء میں جب یہ جنگ ہوئی تو سوار محمد حسین شہید شکر گڑھ کے علاقے میں متعین تھے۔ ان کی حیثیت آرمڈ کور میں ایک عام ڈرائیور کی سی تھی اور جنگ میں سوائے گاڑیوں کے نقل و حرکت کے ان کا کوئی کام نہ تھا لیکن جنگ شروع ہونے سے لے کر شہید ہونے تک انہوں نے ہر کام رضاکارانہ طور پر اپنے فرائض کی حدود سے بڑھ کر انجام دیا۔ جنگی مصلحتوں کے پیش نظر بالعموم گاڑیوں کی نقل و حرکت کم کر دی جاتی ہے اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کی خاطر انہیں محاذ جنگ سے دور کسی محفوظ جگہ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ڈرائیوروں کو اپنی اپنی گاڑیوں میں موجود رہنا پڑتا ہے اور ان کے ذمہ اور کوئی ڈیوٹی نہیں لگائی جاتی۔ لیکن سوار محمد حسین ان تمام قواعد و ضوابط سے بے نیاز دیوانہ وار اپنے مجاہدوں کو گولہ بارود کی سپلائی کرتے رہے حالانکہ وہ چاہتے تو محاذ سے دور اپنی گاڑی میں محفوظ ہو کر بیٹھ سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا اور محاذ کے اگلے مورچوں میں اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش لڑتے رہے۔ ان کی شہادت کے بعد سرکاری تذکرے میں لکھا گیا کہ شہید نے تنہا دشمن کے سولہ ٹینک تباہ کیے۔

جنگ کا جذبہ تو ان کے رگ و پے میں 1965ء میں دوڑ رہا تھا لیکن اس کا

اظہار انہوں نے 1971ء کی جنگ میں کیا۔ 3 دسمبر 1971ء کو جب ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا تو سوار محمد حسین شہید "باہر" نام کے گاؤں شکر گڑھ سیکٹر میں تھے۔ سوار محمد حسین نے ساری رات اپنے مجاہدوں کو اسلحہ کی سپلائی میں گزار دی۔ وہ ایک ایک مورچے میں گئے اور اپنے دوستوں کا ہاتھ بٹایا۔ حالانکہ اس وقت دشمن کی جانب سے فائرنگ زوروں پر تھی اور سخت خطرہ تھا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ یہ جو کچھ کر رہے تھے۔ ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ ان کی ڈیوٹی تو بس اتنی تھی کہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے رہیں اور نئے احکامات کا انتظار کریں۔

5 دسمبر کو شہید کی لانسر رجمنٹ کو دشمن کے مقابل میں آجانے کے احکامات موصول ہوئے۔ اسی روز سوار محمد شہید اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل طفیل محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواہش ظاہر کی کہ انہیں رضاکارانہ طور پر اسلحہ کی فراہمی کا فریضہ سونپ دیا جائے۔ کیونکہ ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو کیے ہوئے محاذ سے دور خاموش اپنی گاڑی میں بیٹھے رہیں۔ کمانڈنگ آفیسر نے ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ایک اسٹین گن بھی مل گئی اور اسلحہ سے لیس ہو کر اگلی صفوں میں دشمن کے سامنے اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش جہاد میں مصروف ہوگئے اس روز کمانڈنگ آفیسر کو یہ حکم ملا تھا کہ نالہ ڈیک اور بہیں کے درمیانی چودہ میل میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لیں۔ اگرچہ یہ کام آسان نہ تھا لیکن پاکستانی مجاہدوں نے اپنی غیر معمولی شجاعت اور مثالی عزم و استقلال کی بدولت اس ناممکن کام کو بھی کر دکھایا اور دشمن کی شرمناک ہزیمت کا باعث بنے۔ جنگی مصلحتوں کا یہ تقاضا تھا کہ دشمن کو اس علاقے میں کچھ دیر تک روکے رکھا جائے۔ چنانچہ 5 دسمبر سے 9 دسمبر تک دشمن کو روکا گیا۔ اس دوران دشمن نے کئی بار حملوں سے پیش قدمی کی کوشش کی مگر ہر بار اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جاتا رہا۔

اس تمام وقت کے دوران سوار محمد حسین کا اضطراب اور بے کلی دیدنی تھی۔ انہوں نے ایک پل کے لیے آرام نہ کیا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے والے ہیں۔ 9 دسمبر کو وہ ادھر ادھر چکر لگا کر دشمن کے ٹھکانوں کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر انہیں پتہ چلا کہ مکار دشمن موضع ہرڑ خورد

میں کھیڑا نامی گاؤں کے قریب موجود ہے۔ یہ دیکھنا تھا کہ سوار محمد حسین شہید کے تن بدن میں اک آگ سی لگ گئی۔ دشمن کو ختم کرنے کا جنون ان کے سر پر کچھ ایسا سوار تھا کہ انہوں نے کسی خطرے کی پرواہ کیے بغیر ایک مورچے میں تن تنہا بیٹھ کر دشمن پر فائرنگ شروع کر دی اور اس کے بہت سے سپاہیوں کو موت کی نیند سلا کر واپس آگئے۔

واپس آکر جب انہوں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دشمن کی پوزیشن اور اپنی بہادری کا قصہ سنایا تو سبھی بہت متاثر ہوئے۔ وہ سارا دن شہید نے اپنے ایک ایک ساتھی کو دشمن کی پوزیشن بتانے میں صرف کر دیا۔ اس وقت ان کے چہرے پر دشمن سے انتقام لینے کی سرخی اور شوقِ جہاد کی لالی تھی۔ ان کی بتائی ہوئی پوزیشن کے مطابق پاکستان کے مجاہدین نے دشمن کی خوب تباہی کی اور اسے بھاری جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اس کے بے شمار ٹینک اور دوسرا اسلحہ تباہ کر دیا گیا اور سرکاری اطلاع نامہ کے مطابق سولہ ٹینک صرف محمد حسین شہید نے تباہ کیے تھے۔

جس روز کا یہ واقعہ ہے اس روز "دھگل" کے مورچے پر پاکستانیوں کا قبضہ تھا اور دشمن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس مورچہ پر قابو کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اس وقت ہرڑ کلاں اور ہرڑ خورد کے سامنے ڈھائی ہزار گز کے وسیع علاقے میں پاکستانی فوج کے صرف تین سکویڈرن تھے۔ اور ان تینوں سکویڈرنوں نے دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ان میں سے درمیانی سکویڈرن ہمارے شہید موصوف سوار محمد حسین بھی تھے۔ اب پاکستانی مجاہدوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ نالہ "چو" اور اس سے ملے ہوئے دو نالوں پر مورچہ بندی کریں کیونکہ دشمن کا اس طرف زور بڑھ رہا تھا اور اس کی پیش قدمی کا سخت خطرہ تھا۔ اس علاقے میں چونکہ بارودی سرنگیں نہیں بچھی ہوئی تھیں اس لیے دشمن نے اپنے جدید ترین اسلحہ سمیت اس علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور بالآخر "ہرڑ خورد" پر اپنے پاؤں مضبوط کر لیے۔

اس موقع پر پاکستانی مجاہدوں کو سخت پیچیدہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ "نالہ چو" میں پانی ہونے کی وجہ سے دشمن کی نقل و حرکت اور پوزیشن کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس موقع پر سوار محمد حسین نے اس جرأت کا مظاہرہ کیا جس کے بارے میں تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے مورچے سے نکل کر دشمن کے مورچوں تک پہنچ گئے اور

اس کی پوزیشن کا مکمل جائزہ لے کر واپس آگئے۔ یہ 10 دسمبر کا ذکر ہے کہ وہ صبح صبح بھاگے بھاگے اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کے پاس پہنچے اور انہیں دشمن کے ٹھکانوں اور موجودگی کی اطلاع دی۔ چنانچہ ان کی بتائی ہوئی اطلاعات کے مطابق مجاہدوں نے دشمن پر ہلہ بول دیا یہ حملہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ دشمن گھبرا گیا۔ محمد حسین شہید بھاگ بھاگ کر اپنے ٹینکوں اور ریکال لیس رائفل کے توپچیوں کو دشمن کے مورچوں اور ٹینکوں کی نشاندہی کراتے رہے۔ جنگ زوروں پر تھی دشمن اپنے اسلحہ اور طاقت کی برتری کے نشے میں چور پاکستان کو حریصانہ نظروں سے دیکھ کر آگ کا طوفان اٹھائے ہوئے تھے۔ لیکن پاکستانی مجاہد بھی اپنے سروں کو قسم کھا کر اسے نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ سوار محمد حسین شہید جو اپنے فرائض کی حدود سے بہت آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے۔ بار بار اپنے مورچے میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری کی صدائیں بلند کرتے۔ ان کے نعروں کی آوازیں گولیوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ کا سینہ چیرتے ہوئے جب مجاہدین کے کانوں میں پہنچتیں تو ان کے جسم میں دوڑنے والے خون کی رفتار اور تیز ہو جاتی اور وہ پہلے سے کہیں تیزی سے دشمن کا خاتمہ کرنے لگتے۔

جہاں پاکستانی مجاہدین کے عزم و ہمت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہاں دشمن کے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ سوار محمد حسین شہید موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا مسکرا کر نعرہ لگا رہے تھے اور دشمن کے دل دہلا رہے تھے۔ آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب چند لمحوں کی تکلیف حیات جاوداں کی نوید بن جاتی ہے۔ محمد حسین شہید ایک ساتھی کو دشمن کا ٹھکانہ بتا رہے تھے کہ دشمن کی مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ ان کا سینہ چیرتے ہوئے نکل گئی اور اس طرح وہ وطن کی آن پر قربان ہو گئے۔ محمد حسین شہید نے جس مقصد کے لیے یہ قربانی دی وہ رائیگاں نہ گئی اور وہ حملہ جسے دشمن نے کبر و نخوت میں ڈوب کر کیا تھا۔ بری طرح پسپا کر دیا گیا۔

جنگ کے بعد وزیر اعظم بھٹو جو اس وقت صدر مملکت تھے جب اگلے مورچوں کے معائنے کے لیے گئے تو پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف نے انہیں سوار محمد حسین شہید کے عظیم کارناموں کی روئیداد سنائی۔ جس پر بھٹو صاحب نے ان

کے لیے "نشان حیدر" کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا کہ محمد حسین شہید کی یہ قربانی ہماری تاریخ کا قابل فخر سرمایہ ہے اور انشاءاللہ اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

4 فروری 1972ء کو پاک افواج کے سابق کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن پاک جانب سے شہید کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کے لیے گئے انہوں نے اس موقع پر فاتحہ پڑھی اور فوجی سلیوٹ کیا۔ بعد ازاں ایک سادہ سی تقریب میں انہوں نے شہید کی جاں سپاری اور بلند حوصلگی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور شہید کے پسماندگان کو تین ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔

تاثرات

شہید کے بلند حوصلہ اور عظیم باپ کو جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو وہ کسی کام کے لیے ساتھ والے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ بے اختیار ان کے منہ سے نعرہ تکبیر اور نعرہ حیدری نکلا انہوں نے گھر والوں کو رونے سے منع کر دیا اور کہا:

"میرے بیٹے نے ملک کی خاطر جان دی ہے، اسی طرح اگر میرے اور بیٹے ہوں تو ان کو بھی قوم اور ملک پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ محمد حسین کی شہادت نے نہ صرف میری بلکہ میرے خاندان کی عاقبت سنوار دی ہے۔ انہوں نے شہید ہو کر جنت میں مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ہمیشہ شہادت کے لیے بے قرار رہتے تھے۔"

آپ کی بیوہ محترمہ ارزاں بیگم نے آپ کی شہادت کی خبر سنی تو اسے بڑی ہمت سے برداشت کیا اور اپنے ننھے بیٹے کا منہ چومتے ہوئے کہا:

"اس کا باپ وطن کی آن کے لیے قربان ہو گیا میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

سوار محمد حسین شہید کے کمانڈنگ آفیسر نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

"شہید واقعی نشان حیدر کے مستحق تھے، ان کی مردانگی، بے پناہ

جرأت اور فرض شناسی نے دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا حتیٰ کہ ہرڑ خورد کی فتح کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔"

صوبیدار امیر خاں ملک اے ای سی اپنے ایک مضمون میں شہید کی بہادری کا قصہ بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"ہر طرف آگ، بارود اور دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے اس آگ کے طوفان میں یہ زندہ جاوید ہستی اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر اگلے مورچوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر اپنے خون سے شجاعت کا ایک نیا ورق لکھ رہی تھی۔ یہ وہ عظیم سپاہی تھا جو ماری دنیا کے رسمی اور حفاظتی دفاعی انتظامات سے بالکل بے نیاز ہو چکا تھا اور جس کی بے مثال جرأت شہادت سے قبل ہی رجمنٹ کے افسروں اور جوانوں کے لیے مسلمہ حقیقت اور مشعل راہ بن چکی تھی اور یوں 9 دسمبر کی شام تک یونٹ کا ہر فرد اس کی دلیری، ہمت اور مقصد سے لگن کا قائل ہو چکا تھا۔ یقیناً خوش بخت ہے وہ بیوہ جس کا سہاگ پوری قوم کی امانت بن چکا ہے اور قابلِ فخر ہیں وہ ماں باپ جن کے بیٹے سوار محمد حسین شہید جیسے عزائم رکھتے ہیں۔"

آٹھواں نشان حیدر

لانس نائیک محمد محفوظ شہید

پاک فوج کے چند جوان اپنے ایک ساتھی کو گھیرے میں لیے ہوئے کھڑے تھے جو انہیں دیوار پر مکے مار مار کر باکسنگ کے اصول سمجھا رہا تھا۔ ہر بار جب اس کا وزنی مکہ دیوار پر پڑتا تو ایک دھماکے کی سی آواز پیدا ہوتی اور اس کے ساتھی مسکرانے لگتے۔ اس نوجوان نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی اور دور پڑی ہوئی ایک سخت اینٹ کو اٹھا لایا۔ سب کے سامنے اسے رکھا اور اس پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس کے تمام ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت سے دیکھنے لگے۔ پاک فوج کا یہ جوان جو اپنے وزنی مکوں سے دیوار کو ہلا رہا تھا اور جس کی ایک ہی ضرب سے اینٹ چور ہو گئی — لانس نائیک محمد محفوظ تھا، جس کی جاں نثاری، حب الوطنی اور فرض شناسی کے اعتراف میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز "نشان حیدر" دیا گیا اور جو اس قسم کے کارناموں کی وجہ سے "پاکستان کا محمد علی کلے" کہلاتا تھا۔

لانس نائیک محمد محفوظ شہید کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ایک معمولی سے زمیندار ہیں اور اپنے اچھے اخلاق کی بنا پر علاقہ بھر میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ بزرگانِ دین اور اولیاء کرام سے انہیں بہت عقیدت ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کا دیدار اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا انہیں عشق سا ہے اور اسی میں وہ اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سے انہیں روحانی انسیت ہے اور ان کے خاندان اور جانشینوں کے بہت قدردان ہیں۔ پیر مہر علی شاہؒ کی

تعلیمات کا اکثر پرچار کرتے ہیں اور جب مرشد کی یاد میں بہت محو ہوں تو ان کا یہ نعتیہ مصرعہ وردِ زبان ہوتا ہے

ع کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا، گستاخ اکھیاں کتے جا لڑیاں

یہی کیفیت محفوظ شہید کی والدہ کی ہے۔ وہ عاشقِ رسولؐ ہیں اور سیرتِ پاک کے عین مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔ محفوظ شہید کے والدین درویش منش اور رضائے حق پر صابر و شاکر رہتے ہیں۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے سرنگوں رہنے والے ان نیک لوگوں کو قدرت نے اس انعام سے نوازا جو اس نے اپنے خاص بندوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کی نیک نیتی اور ایمان پروری کا صلہ قدرت نے انہیں محفوظ شہید جیسی اولاد کی صورت میں دیا جس نے نہ صرف وطن کو سرخرو کر دیا بلکہ اپنے آپ کو اور اپنے والدین کو قربِ الٰہی عطا کیا اور ہمیشہ کی زندگی پا گیا۔

ابتدائی حالات

راولپنڈی، گجرات، جہلم اور کیمبل پور کے اضلاع کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ جوان فوج کو مہیا کیے ہیں۔ انہی اضلاع میں موضع راولپنڈی کے ایک گاؤں "پنڈ ملکاں" میں محفوظ شہید 1942ء میں پیدا ہوئے اب اس بستی کا نام شہید کے نام کی نسبت سے تبدیل کر کے "بستی محفوظ" رکھا گیا ہے۔ شہید کو اسلام کی محبت ورثے میں ملی تھی۔ انہوں نے اس ماں کی آغوش سے فیض حاصل کیا جو اپنے لیے نجات کا ذریعہ صرف رسول پاکؐ کی محبت کو سمجھتیں۔ ان کی تربیت ایک ایسے والد نے کی جو عاشقِ رسول ہونے کے علاوہ تصوف و روحانیت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ایسے اوصافِ حمیدہ کے مالک والدین کے ہاتھوں ان کی تربیت خوش قسمتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں قرآن پاک ناظرہ پڑھ لیا۔ ساری عمر نماز کے پابند رہے اور کبھی اسلامی احکامات سے غافل نہ ہوئے۔ بزرگانِ دین سے محبت انہیں باپ سے ورثے میں ودیعت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر محفوظ کے زیرِ مطالعہ بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں اور تاریخ کے ایسے واقعات جو بہادری پر مشتمل ہیں انہیں بے حد پسند تھے اور انہی واقعات نے ان کی سوچ کا خاص انداز بنا دیا تھا۔ وہ مجسمہ ایثار تھے۔ عارفانہ



لانس نائیک محمد محفوظ شہید نشانِ حیدر

کلام اور نعتیہ کلام انہیں بہت پسند تھا اور اکثر اپنی میٹھی اور سریلی آواز سے یہ شعر پڑھتے ۔

حدوں بے حد درود نبیؐ نے جس دا کل پیارا ہو
میں قربان تنہاں توں باہو جنہاں دیکھیا نبیؐ پیارا ہو

جب محفوظ کی عمر پانچ سال ہوئی تو انہیں گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ شروع ہی سے بے حد ذہین اور محنتی تھے لیکن پڑھائی سے زیادہ کھیل کود میں رغبت ہونے کی وجہ سے ان کا شمار جماعت میں درمیانے درجے کے طالب علموں میں تھا۔ 1961ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو گھر والوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ کوئی اچھی سی ملازمت کریں مگر ان کا شوقِ سپاہ گری انہیں فوج میں لے گیا اور 1962ء میں وہ فوج میں بطور سپاہی کے بھرتی ہو گئے اور ابتدائی ٹریننگ کے بعد ان کا تقرر 10 پنجاب رجمنٹ میں ہوا۔

سیرت و کردار

محمد محفوظ کا تعلق ایک خالص اسلامی گھرانے سے تھا اس لیے مذہب سے محبت قدرتی بات تھی۔ بزرگانِ دین سے لگاؤ ان کی فطرت میں سما چکا تھا۔ نعتیہ کلام انہیں کافی حد تک حفظ تھا۔ بچپن ہی سے بہت پھرتیلے اور چاک و چوبند تھے۔ ہر وقت مسکراتے رہنا اور خوش کلامی ان کی نمایاں عادت تھی۔ وہ ابتدا ہی میں اپنے گاؤں کے دوستوں کے ہمراہ کبڈی، کھدو، کھونڈی، دوڑ اور مکا بازی (باکسنگ Boxing) کے ماہر ہو گئے تھے۔ فوج میں بھی باکسنگ کا شوق کم نہ ہوا۔ ٹریننگ کے دوران ان کی باکسنگ اپنے ساتھیوں کے لیے دلچسپیوں کا باعث بن گئی تھی۔ اینٹ پر ہاتھ مار کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ان کے لیے بہت معمولی تھا۔ اس کے علاوہ سخت دیوار پر مکے مارنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو باکسنگ کا شوقین بنا دیا تھا اور انہیں اس سلسلہ میں باقاعدہ ٹریننگ دیا کرتے تھے۔ باکسنگ میں ان کی مہارت کو دیکھتے ہوئے انہیں ان کے دوست "پاکستانی محمد علی کلے" کہہ کر پکارتے تھے۔ انہوں نے فوج میں باکسنگ کے کئی مقابلے جیتے اور انعامات حاصل کیے حتیٰ کہ مڈل ویٹ باکسنگ میں چیمپئن قرار دیئے گئے۔

محمد محفوظ کی یہ برتری صرف باکسنگ تک ہی محدود نہ تھی وہ کبڈی کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ ان کی پھرتی اور تیزی ان کے مقابل کو حیران کر دیا کرتی تھی اور وہ اپنے سے کئی گنا طاقتور کھلاڑی کو نیچا دکھا دیا کرتے تھے۔ باکسنگ کا مقابلہ ہوتا یا کبڈی کا میدان، لمبی دوڑیں ہوتیں یا طاقت کے مقابلے میں محمد محفوظ سب سے آگے رہتے اور ان کی موجودگی ہی کامیابی کی دلیل ہوا کرتی تھی۔

محمد محفوظ اپنے دوستوں سے بے حد پیار کرنے والے تھے۔ اگر تھوڑی دیر بھی دوستوں کے بغیر گزر جاتی تو وہ اداس سے ہو جاتے اور خود دوستوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ وہ جسم کے جتنے سخت تھے دل کے اتنے ہی نرم تھے۔ دوسروں کو پریشان یا مصیبت میں دیکھ کر ان کا دل بھر آتا اور اکثر وہ دوسروں کے لیے خود کو مصیبت میں ڈال لیا کرتے تھے۔ دوست کسی بھی قسم کی امداد کا مطالبہ کرتے یہ فوراً تیار ہو جاتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو یہ بے چین سے ہو جاتے اور اس کی تیمارداری اور عیادت میں اپنا آرام و سکھ تک قربان کر دیتے۔

محمد محفوظ کی زندگی بہت سادہ تھی اس میں کسی قسم کے تکلف و تصنع کو دخل نہ تھا۔ اوائل عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ مل کر کھیتوں میں ہل جوتا کرتے تھے۔ گھر کا جو کام بھی انہیں سونپ دیا جاتا وہ اسے کرنے پر فوراً راضی ہو جاتے۔ وہ اپنے والدین کے بے حد پیارے اور تابع فرمان تھے۔ ٹریننگ اور ملازمت کے دوران انہوں نے محنت، لگن، فرض شناسی اور کارکردگی کی بنا پر اپنے افسران کے دل جیت لیے تھے۔ ہر کوئی ان کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور محفل ساز انسان تھے۔ ان کی دلچسپ باتیں اور مترنم آواز نے ان کے ساتھیوں کو ان کا پرستار بنا دیا تھا۔ ایک وقت میں وہ سخت اور ٹھوس قسم کے کھلاڑی اور نرم و نازک مزاج فنکار تھے۔ طبیعت کے اس انتہائی تضاد کے باوجود ان کی شخصیت کی اپنی انفرادیت تھی کہ وہ موقع شناس اور مزاج شناس تھے۔ جس سے ملتے اسی کے ہو کر رہ جاتے۔ وہ اپنے مقابل کو جیتنے کے تمام گر جانتے تھے۔ جو بھی ملتا اس سے اسی کے مزاج کے موافق باتیں کرتے۔

ساری عمر نماز اور روزے کے پابند رہے۔ معرفت الٰہی سے ان کا دل پوری طرح منور تھا۔ چہرے پر چھائی مسکراہٹ ان کے اطمینان قلب کی غماز تھی۔ اپنے وطن

سے انہیں جو پیار تھا اس کے ثبوت میں انہوں نے جان تک قربان کر دی۔

پل کنجری والا کا معرکہ

1971ء میں بھارت نے بعض بڑی طاقتوں کے ایما پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور باوجود نامساعد حالات کے ہمارے جیالوں نے اسے کومیلا اور جیسور سیکٹر میں زبردست ہزیمت سے دوچار کیا۔ ہندوستان نے چونکہ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا تھا لہٰذا بحیثیت مجموعی اس کا پانسہ بھاری رہا۔ مکار دشمن نے جب مشرقی پاکستان کے بعض محاذوں پر مار کھائی تو اس نے کشمیر اور مغربی پاکستان کے محاذ کھول دیئے تاکہ ہماری دو طرفہ توجہ سے وہ مشرقی پاکستان میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

مغربی پاکستان میں جنگ کا شروع ہونا تھا کہ ہماری افواج نے اپنی شاندار روایات کے مطابق غنیم کو اس کے علاقے میں دھکیلنا شروع کر دیا۔ ہر محاذ پر اس کی وہ مرمت کی کہ وہ "الامان" پکار اٹھا۔ بالخصوص واہگہ اور اٹاری سیکٹر میں تو ہمارے مجاہدین کی جان توڑ کوششوں کے آگے وہ بے بس ہو گیا۔ اور الٹے قدموں بھاگنے لگا۔ ہمارے مجاہدین فاتح بن کر دشمن کے اس علاقے میں گئے اور اسلحہ کے علاوہ کئی اہم دستاویزات پر قبضہ کر لیا۔ اٹاری سیکٹر میں موضع سانکے اور دریا کے نواح میں زبردست جنگ ہوئی اور پاکستانی بہادروں نے ہندو کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی جہنم واصل کیے گئے اور اسی سیکٹر میں ہماری بہادر افواج کی 15 پنجاب رجمنٹ نے پل کنجری والا پر قبضہ کر لیا اس روز سے لے کر جنگ بندی تک دشمن نے اس علاقے کو آزاد کرانے اور پاکستان کی بہادر افواج کو گھیرے میں لینے کی پوری کوششیں کیں لیکن اس کا بس نہ چلا۔ مکار دشمن خود کار ہتھیاروں اور فضائی حملوں سے مجاہدین کو ہراساں کرنے کی برابر کوششیں کر رہا تھا مگر مجاہدین جمے کھڑے تھے انہی مجاہدین میں ہمارے شہید موصوف لانس نائیک محمد محفوظ بھی تھے۔

16 دسمبر کو جب جنگ بندی کا اعلان ہوا تو پاکستانی مجاہدین نے اس اعلان کے تحت اپنی کارروائیوں کو بند کر دیا۔ مکار دشمن نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رات کی

تاریکی میں ایک بار پھر زبردست حملہ کر دیا تاکہ وہ اپنے علاقے کو واپس لے سکے۔ چونکہ یہ حملہ مکاری اور بے اصولی سے کیا گیا اور پھر جنگ بندی کے اعلان سے پاکستانی مجاہدین مطمئن ہو چکے تھے اس لیے دشمن مسلسل گولہ باری کرتے ہوئے چند قدم بڑھ آیا اور پل کنجری والا کے مورچوں پر قابض ہو گیا۔ دشمن نے یہ حملہ اتنی شدت سے کیا تھا کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ بڑھتا ہوا پاک سرزمین کے کسی علاقے ہی میں داخل نہ ہو جائے۔ اس وقت پاکستانی مجاہدین کھلے میدان میں دشمن کے بالکل سامنے کھڑے تھے اور ان کے چھپنے کے لیے کوئی آڑ بھی نہ تھی جبکہ دشمن اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔

دشمن کا ارادہ پاک فوج کے جوانوں کو گھیرے میں لینے کا تھا اس مقصد کے لیے اس کی ایک پلاٹون تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ابھی دشمن اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ ایک مشین گن حرکت میں آئی اور آن کی آن میں دشمن کے تمام سپاہی زہر کھائے کتوں کی طرح ڈھیر ہو گئے۔ یہ کارنامہ لانس نائیک محمد محفوظ نے سرانجام دیا تھا۔ محمد محفوظ نے اپنی بے پناہ ہوشیاری اور بہادری سے آگے بڑھتے ہوئے دشمن کو روک دیا تھا اور اس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس شکست پر دشمن سٹپٹا کر رہ گیا اور اس نے ضد میں آ کر پہلے سے بھی شدید حملہ کیا۔ محمد محفوظ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کھلے میدان میں دشمن کے بالکل سامنے برسرپیکار تھے۔ وہ کسی خطرے کی پرواہ کیے بغیر اپنی مشین گن سے نکلتی گولیوں سے دشمن کو نشانہ بنا رہے تھے کہ ایک گولہ ان کی مشین گن کو آ کر لگا جس سے نہ صرف مشین گن ناکارہ ہو گئی بلکہ ان کی ایک ٹانگ بھی زخمی ہو گئی۔ اسی وقت ان کے ایک ساتھی لانس نائیک محمد صادق بھی شہید ہوئے۔ محمد محفوظ نے ایک نظر اپنے شہید دوست کو دیکھا اور اپنی ناکارہ مشین گن پھینک کر دوست کی مشین گن اٹھا لی اور دوبارہ دشمن کے لیے موت بن گئے۔ انہیں دشمن پر فائر کرتے تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک گولہ ان کے قریب آ کر پھٹا اور وہ پہلے سے زیادہ زخمی ہو گئے علاوہ ازیں ایک بار پھر مشین گن ناکارہ ہو گئی۔

محمد محفوظ نے محاذ کا اچھی طرح جائزہ لیا اور انہوں نے دیکھا ایک مضبوط مورچے میں دشمن کا جوان بیٹھا ہے جس کی مسلسل فائرنگ سے پاک فوج کو نقصان پہنچ

رہا ہے۔ محمد محفوظ نے اس مورچے پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اس مورچے کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن نے جب انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو ان پر فائرنگ کر دی جس سے وہ شدید زخمی ہوئے لیکن ان کے عزم صمیم میں معمولی سا بھی فرق نہ پڑا۔ بلکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ جرأت اور دلیری سے اس مورچے کی طرف بڑھتے گئے اور اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ عین اسی وقت ایک گولی ان کا سینہ چیرتے ہوئے نکل گئی۔ مگر محمد محفوظ نے موت کو اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ایک جست لگا کر انہوں نے دشمن کے گن مین کی گردن دبوچ لی۔ اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس کا آخری سانس بھی جسم سے نہ نکل گیا۔ پاکستان کے مجاہدین کو نقصان پہنچانے والا گن مین محمد محفوظ کے طاقتور ہاتھوں میں دم توڑ چکا تھا اور اس کی گن اوندھے منہ گری پڑی تھی۔ اسی وقت ایک دوسرے بھارتی سپاہی نے پیچھے سے آ کر ان پر سنگین سے وار کیا۔ مگر محمد محفوظ اس سے پہلے ہی اپنے وطن کی آن پر قربان ہو چکے تھے۔ اپنے مشن کی تکمیل پر ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔ محمد محفوظ شہید ہو چکے تھے۔

جنگ بندی کے بعد جب پاکستانی مجاہدین کے حوالے سے محمد محفوظ کی لاش لی گئی تو ایک سکھ کرنل نے محمد محفوظ کی بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہ جوان بالکل باکسروں کی طرح لڑ رہا تھا۔

محمد محفوظ شہید ہو چکے تھے لیکن اپنے پیچھے بہادری، جاں نثاری اور جرأت آموزی کی ایک نئی داستان چھوڑ گئے۔ ان کے اس کارنامے کے صلے میں انہیں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز "نشان حیدر" دیا گیا۔ اس موقع پر پاک فوج کے کمانڈر نے شہید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمد محفوظ کی شہادت عزم و ہمت کی عظیم داستان ہے جسے ہم تاریخ کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ پوری پاکستانی قوم کو ان کے اس کارنامے پر بجا طور پر فخر ہے۔ وہ شہید ہیں۔۔۔ اور شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

نواں نشان حیدر

کیپٹن کرنل شیر خان شہید

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں کشمیری مجاہدین نے بے پناہ قربانیاں دے کر آزادی کی خاطر اکیسویں صدی کو لہو رنگ روشنیوں میں خوش آمدید کہا۔ ہندوستانی فوجوں نے جس شدت کے ساتھ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو دبانے کی کوشش کی تھی، وہ اتنی ہی توانائی کے ساتھ رواں دواں تھی، کشمیری مجاہدین کفن بدوش میدان کارزار میں اتر چکے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہزاروں کہنہ مشق بھارتی فوجی شبانہ روز شدید سے شدید کارروائیاں کر رہے تھے۔ حریت پرستوں پر قابو پانے کی خاطر کم و بیش سات لاکھ بھارتی فوجی مسلط تھے۔

یہ وہی دور ہے کہ جب کارگل اور دراز کا اٹھارہ ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند علاقہ اس جنگ آزادی کی زد میں آ گیا تھا۔ اس دور میں شیر خان ابھی پاک فضائیہ میں زیر تربیت ہی تھا۔ اس وقت کشمیر میں مسلح مزاحمتی جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔

ابتدائی حالات

کیپٹن کرنل شیر خان شہید یکم جنوری 1970ء کو ضلع صوابی کے ایک چھوٹے سے گاؤں فوجون آباد میں پیدا ہوئے۔ صوبہ سرحد میں صوابی ایک مشہور مردم خیز علاقہ ہے۔ تربیلا ڈیم، ٹوپی اور مردان کے قریب ضلع صوابی اپنی زرخیزی اور پیداواری دولت کے باعث بہت مشہور ہے۔ صوابی میں گنا، تمباکو اور گندم زیادہ مشہور فصلیں ہیں۔

دریائے سندھ کے کنارے صوابی ضلع اٹک سے شمال کی جانب ایک مشہور زرعی شہر ہے۔ شیر خان کا خاندان اسی ضلع کے ایک گاؤں میں بڑی باعزت زندگی گزار رہا ہے۔ شیر خان کے دادا اپنے علاقے کے معزز اور معتبر شخص تھے۔ اسی علاقے میں ایک بہادر شخص شیر خان بے شمار لوگوں میں اپنی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے بڑا مشہور تھا۔ اس بہادر اور دلاور شیر خان نے 1948ء میں آزادی کشمیر کی جنگ میں بڑا بھرپور حصہ لیا۔ بتاتے ہیں انہوں نے بھارتی فوج کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اسی شیر خان کے نام پر آپ کے دادا نے آپ کا نام ''کرنل شیر خان'' رکھا۔ کرنل ان کا فوجی رینک نہیں تھا بلکہ دادا کی جانب سے پیار سے دیا ہوا لقب تھا۔

گویا شیر خان بچپن ہی سے والد اور دادا کی محبت کے باعث کرنل شیر خان کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ شیر خان نے اپنی تعلیم و تربیت اپنے گاؤں فوجون آباد ہی سے شروع کی اور پھر میٹرک کا امتحان انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول نواں کلی صوابی سے پاس کیا۔ اور پھر گورنمنٹ کالج صوابی سے ایف ایس سی کا امتحان نمایاں پوزیشن میں پاس کیا۔

فوج میں خدمات

شیر خان اپنی عین نوجوانی کے عالم میں 1987ء میں ایئر مین کی حیثیت میں پاک فضائیہ میں بھرتی ہوئے۔ یہاں پر اپنی ٹریننگ کے دوران میں انہوں نے محنت اور لگن کا ثبوت دیا اور ''شاہین بچے'' کا خطاب پایا۔

اس کے بعد شیر خان نے میری فوج میں کمیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر 1992ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول (ایبٹ آباد) میں تربیت کے لیے چلے گئے۔ اکتوبر 1994ء میں انہوں نے کورس مکمل کر لیا۔

بتایا جاتا ہے کہ شیر خان کو شروع ہی سے اسلام اور پاکستان سے بے پناہ محبت تھی۔ ملکی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ فوج کی سروس نے ان کے اس جذبے کو اور بھی فروغ دیا۔

شیر خان کو مطالعے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کھیل،

لکھائی، پڑھائی اور پیشہ ورانہ کورسز میں بھی وہ بڑے ہی مستعد اور آگے آگے ہی تھے۔ اپنی انہی امتیازی مصروفیات اور اسلام اور پاکستان سے محبت فراواں کے سبب وہ اپنی یونٹ میں ''شیرا'' کے نام سے مشہور و مقبول تھے۔

ان کے ساتھیوں کا بتانا ہے کہ دین اسلام سے ان کی محبت دیدنی تھی۔ وہ خوش خصال تھے، لوگوں اور دوستوں سے الفت اور محبت کا رشتہ استوار رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے وہ ہر دلعزیز بنے ہوئے تھے۔

جذبہ محنت سے سرشار

ہر کام کاج کو وہ چاہت اور دل سے کرتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے اصول ''کام کام اور کام'' کو ہی وہ سدا مدنظر رکھتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہیں یہ امتیاز حاصل تھا کہ جب بھی وہ فوجی جوانوں سے کوئی کام لینا چاہتے تو پہلے وہ اس کام کو خود کرتے اور پھر وہ انہیں کام کرنے کا کہتے۔

معرکہ کارگل کا شیر

یکم جنوری 1998ء کو شیر خان کو ناردرن لائٹ انفنٹری کے اس یونٹ میں بھیج دیا گیا کہ جو کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی کارگل کی سترہ اٹھارہ ہزار فٹ بلند چوٹیاں بھی اپنی فوجی اہمیت اور حیثیت کے باعث خاص مقام حاصل کر چکی تھیں۔ ان پہاڑوں پر سارا سال برف ہی جمی رہتی تھی۔ مجاہدین حریت نے ان برفانی چوٹیوں پر بھی اپنے مورچے اور چوکیاں قائم کر لی تھیں۔

یہیں پر وادی کارگل میں پاکستانی فوجوں نے بھی کئی اہم چوکیاں بنا رکھی تھیں۔ برف سے ڈھکی ہوئی کسی بھی چوٹی پر کوئی چوکی قائم کرنا معمولی اور آسان کام نہیں تھا۔ شدید موسمی حالات بھی بہت بڑی قدرتی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ مجاہدین اور فوجوں نے ان نامساعد اور شدید موسمی حالات کی موجودگی میں بھی برفانی چوٹیوں پر پانچ چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ اور ان چوکیوں پر سے وہ بھارتی فوجیوں کے کئی حملوں کو ناکام بناتے رہتے تھے۔ پاکستانی فوجوں کی یہ چوکیاں جنگی نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور

تدبیر و حکمت عملی کے اعتبار سے بھی خاص مقام کی حامل تھیں۔

پاکستان کی ان چوکیوں پر بھارتی فوج مسلسل سخت ترین حملے کرتی رہتی تھی' اس محاذ پر بھارتی فوج نفری میں بھی بہت زیادہ تھی' اس کی یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان پاکستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا جائے۔

پاکستانی فوج اپنی ان چوکیوں پر سے حملے کر کے ہندوستانی فوج کی رسد کا راستہ بھی بند کر دیتی تھی۔ لہٰذا ان چوکیوں پر ہمہ وقت نگرانی اور دشمن پر حملوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستانی فوج کی نفری محدود بلکہ بہت کم تھی۔ لیکن ٹھیک ٹھیک حملوں اور نشانوں سے دشمن کو بدستور بھاری نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔

رزمِ حق و باطل میں شیر خان

ان چوکیوں پر شیر خان کی نگرانی اور ذمے داری تھی۔ شیر خان نے ان چوکیوں کو اپنی ذہانت' بہادری' ذمہ داری اور حکمت عملی کے باعث ناقابل تسخیر قلعوں جیسی بنا رکھا تھا۔ اسی مقصد کے لیے کرنل شیر خان کو مسلسل چوکس رہنا پڑتا تھا اور وہ کئی راتیں سو بھی نہیں سکے تھے۔ وہ دن رات دشمن پر عقابی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آرام اور سکون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری جنگی حکمت عملی کے ساتھ دشمن کے حملوں کو ناکام بناتے رہے تھے۔

وادیٔ کارگل میں گلتری کے مقام پر کرنل شیر خان کی بنائی ہوئی یہ پانچوں چوکیاں دفاعی نقطہ نگاہ سے ناقابل تسخیر بنی ہوئی تھیں۔ اور ان کی نگرانی اور حفاظت کیپٹن کرنل شیر خان ایک شیر ببر کی طرح کر رہے تھے۔

پھر 7 اور 8 جون 1999ء کی درمیانی شب کیپٹن کرنل شیر خان کی پوسٹ کی پچھلی جانب سے دشمن کی ایک بٹالین نے حملہ کرنے کی کوشش کی' دشمن کے اس حملے کو بھی شیر خان نے مردانہ وار ناکام بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ دشمن کی مکمل طور پر ناکہ بندی کر دی تھی۔ ہر حملے اور دفاعی وار میں دشمن کو بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

8 جون کو جبکہ دشمن پتھریلی چٹانوں کے پیچھے چھپا تازہ کمک کا اہتمام کر رہا تھا' عین اس وقت کیپٹن کرنل شیر خان اپنے جوانوں پر مشتمل ایک "لڑاکا گشت" کی قیادت

سنبھالے ہوئے فن حرب' لشکر کشی' طریقہ کار اور بہتر اور موثر حکمت عملی کا بھرپور جائزہ لے رہا تھا۔ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے منصوبے پر عملی غور و خوض کیا جا رہا تھا۔

پھر جب کیپٹن کرنل شیر خان نے ساری منصوبہ بندی مکمل کر لی تو انہوں نے اپنی "لڑاکا گشت" کے ہمراہ دشمن پر بھرپور اور کامیاب حملہ کر دیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچ گیا اور اس وقت دشمن کے چالیس سپاہی جہنم واصل ہوئے۔

میدان کارزار میں کارنامے

اسی محاذ پر اور انہی پاکستانی چوکیوں پر کئی دنوں تک دشمن کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد کئی ناکامیوں اور پے بہ پے ہزیمتوں کے بعد بھارتی دشمن دو بٹالین کی نفری کے ساتھ ایک روز کرنل شیر خان کی چوکی پر کئی جانب سے حملہ آور ہوا۔ بتایا جاتا ہے اس حملے میں دشمن نے اپنے توپ خانے سے بارہ ہزار سے زیادہ گولے برسائے۔ یہ ایک پرزور اور ہمہ پہلو بھرپور حملہ تھا۔

دشمن کا یہ شدید حملہ کیپٹن کرنل شیر خان کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس حملے میں دشمن نے شیر خان کی چوکی کے ایک مختصر سے حصے پر اپنا قبضہ کر لیا تھا لیکن کرنل شیر خان نے حوصلہ نہ ہارا۔ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ وہ اپنے مٹھی بھر جوانوں کو لے کر بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑا اور جلد ہی اپنی چوکی کے کھوئے ہوئے حصے پر دوبارہ اپنا قبضہ کر لیا۔ اس معرکے میں دشمن کے تین سو سپاہی کھیت ہوئے اور شکست و رسوائی دشمن کا مقدر ٹھہری۔

کرنل شیر خان کے فوجی ساتھیوں کا بتانا ہے کہ اس زبردست معرکے میں کرنل شیر خان خود بھی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ شدید زخموں اور گہرے گھاؤ نے انہیں نڈھال کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی دشمن کا مقابلہ جاری رکھا۔ آخر وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جیتی ہوئی چوکی پر جام شہادت نوش فرما گئے۔

بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ دین اسلام کے لیے اپنے وطن پر جان وار چکے تھے'

لیکن شہادت کے بعد بھی ان کی انگلی بندوق کی لبلبی پر اسی طرح جمی ہوئی تھی جس طرح ٹیپو سلطان کا ہاتھ شہادت کے بعد بھی ان کی تلوار میں پیوست تھا۔

کیپٹن کرنل شیر خان نے معرکہ کارگل میں جو لازوال' انمٹ اور مثالی کارنامے سرانجام دیئے اور جس شوق اور جذبے کے ساتھ انہوں نے دین اور وطن کی خاطر اپنی جان کی قربانی پیش کی۔ انہی کے اعتراف کے طور پر انہیں پاکستان کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشان حیدر دیا گیا۔

کیپٹن کرنل شیر خان' نشان حیدر حاصل کرنے والے نویں مجاہد ہیں۔

دسواں نشان حیدر

حوالدار لالک جان شہید

شمالی علاقہ جات کا سپوت

سطح سمندر سے آٹھ سے دس ہزار فٹ بلندی پر پاکستان کے انتہائی شمال میں شمالی علاقہ جات کا ایک وسیع و عریض خطہ واقع ہے۔ یہ علاقہ اسلام آباد سے قریباً چار سو میل دور اپنے اندر بے شمار قدرتی خوب صورتیوں اور ان گنت دلکشیوں کو لیے ہوئے ہے۔

یہ شمالی علاقہ جو کم و بیش تیس ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، دریائے سندھ، دریائے گلگت، دریائے ہنزہ، دریائے شیوک اور دریائے شگر کی یہ حسین وادی گویا ایک طرح سے وادی کشمیر کو اوپر کی جانب سے گھیرے ہوئے ہے۔

ان شمالی علاقہ جات میں گلگت، سکردو، دیامیر، غذر اور گانچے اضلاع شامل ہیں۔ عام طور پر اس علاقے کو گلگت اور بلتستان کا علاقہ بھی کہا جاتا ہے۔

ابتدائی حالات

حوالدار لالک جان شہید اسی وادی کے ایک چھوٹے سے قدرتی نظاروں میں گھرے ہوئے گاؤں ہندور میں 1967ء میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں ضلع غذر میں واقع ہے۔ یہاں سے دور پہاڑی سلسلوں میں متعدد برفانی تودے اور گلیشیرز اپنی چمک دمک دکھاتے رہتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی ساتھ بلند و بالا میدانوں، وادیوں، ڈھلوانوں اور

تھوڑے تھوڑے میدانی علاقوں میں کئی ندی نالے، آبشاریں اور ٹھنڈے اور گرم پانیوں والے جھرنے پورے علاقے کو جنت نظیر بنا دیتے ہیں۔ اس حوالے سے یہاں کے لوگوں کی قدرت اور قدرتی نظاروں اور خوبصورتیوں سے براہ راست وابستگی انہیں اور بھی حسین بنا دیتی ہے۔

حوالدار لالک جان شہید کا خاندان ایک عام سا لیکن محنتی خاندان تھا۔ پورے ضلع غذر کے لوگ محنتی، جاں نثار، سخت جاں اور جفاکش ہیں۔ کارخانے اور فیکٹریاں نہ ہونے کے باعث محنت مزدوری، کھیتی باڑی یا مویشی پالنا اس خطے کے لوگوں کے ذرائع روزگار ہیں۔ ان علاقوں میں میری آب و ہوا بڑے رنگ دکھاتی ہے۔ سردیوں میں شدید سردی پڑتی ہے اور برف باری بھی ہو جاتی ہے۔

موسم گرما میں جب برف پگھلنے لگتی ہے تو اسی موسم میں ہر طرف زندگی زیادہ فعال ہو جاتی ہے۔ دور نزدیک رونق دکھائی دینے لگتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایسے ہی حسین موسم میں ایک سہانی صبح گاؤں کے چند خوش خصال دوستوں نے مل کر خدمت خلق کی ایک انجمن بنائی۔ اس کا نام "المدد ویلفیئر آرگنائزیشن" تھا۔

حوالدار لالک جان شہید اس فلاحی انجمن میں ایک سرگرم اور بانی رکن کے طور پر مختلف حوالوں سے لوگوں کی خدمت کرتے رہے۔ انہیں انسانوں، اہل وطن اور مادر وطن کی خدمت کا جذبہ اسی بچپن ہی کے دور سے لبھانے لگا تھا۔ وہ اپنے بچپن میں بھی دوسروں کی خدمت کر کے خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔

بنیادی تعلیم و تربیت

پھر نوجوانی کی عمر میں لالک جان نے اپنے گاؤں ہی سے واجبی سی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لیکن انہوں نے اپنی عملی خدمات اور جذبات ہی کو اولیت دیئے رکھی۔

اس خطہ ارض شمالی علاقہ جات کی حیثیت اور اہمیت کو شاہراہ ابریشم نے کئی چند کر دیا ہے، اس کے ساتھ یہاں کی نباتاتی اور معدنی اور حیوانی دولت نے بھی لوگوں کی زندگی کو بڑا معتدل اور ملنسار بنا رکھا ہے۔ وہ بچے جو سیب، اخروٹ، بادام، خوبانی اور آلو بخارے کے باغات اور جھنڈوں میں کھیلتے کودتے جوانی میں قدم رکھتے ہیں وہ بہت جلد

وہاں کے جانوروں آئی بیکس، یاک، مارخور، لومڑیوں، مارکوپولو بھیڑوں اور برفانی چیتوں سے اور ان سے وابستہ لوک کہانیوں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ یوں ان میں بہادری، جذبہ تجسس اور مقابلہ کرنے کی ترنگ پیدا ہو جاتی ہے۔

سوار لالک جان بھی انہی وادیوں اور اسی قدرتی رعنائیوں بھرے ماحول میں وہاں کے عام سے بچوں کی طرح پرورش پاتے رہے۔ ان وادیوں میں آٹھویں اور نویں ہجری کے دوران میں، ہمدانی سیدوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے اسلام پھیلا۔ اس وقت سے پہلے ان خطوں میں کئی تہذیبیں ابھریں لیکن سب سے واضح اثر بدھ مت کا تھا۔ مگر جب اسلام کی پرامن اور عافیت بخش تعلیمات نے معاشرے کو باہمی برادرانہ رشتوں میں منسلک کیا تو اس وقت سے یہاں کے لوگوں میں ملائمت، حسن اخلاق، ملنساری اور انسانیت نوازی کے جذبات و احساسات امتیازی طور پر دکھائی دینے لگے۔ اور اسی وقت سے یہاں کی زبان میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی۔ لالک جان اسی ماحول اور انہی حالات میں بڑھا پھولا اور پرورش پائی۔

برسوں تک پاکستان کے یہ شمالی علاقہ جات اپنی تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مقفل سے رہے لیکن 1975ء کے بعد سے ان علاقوں کو جب سڑکوں اور ہوائی راستوں کے ذریعے سے بڑے بڑے مراکز سے ملا دیا گیا تو لوگوں میں آمد و رفت اور باہمی روابط سے تعمیر و ترقی کی رفتار کئی چند ہو گئی۔ یوں لوگوں میں آسودگی اور خوشحالی دکھائی دینے لگی اور وہ بھی ملکی اور قومی ترقی میں بجا طور پر اپنا حصہ لینے لگے۔

حوالدار لالک جان کا گھرانہ ایک مذہبی سا گھرانہ تھا۔ لالک جان شروع ہی سے ماں باپ کا فرمانبردار تھا اور بڑوں کی عزت کرتا اور جذبہ خدمت سے سرشار رہتا تھا۔ غریبوں کی مدد اور خدمت کر کے اسے خوشی ملتی تھی۔ لالک جان نے اپنے علاقے میں المدد آرگنائزیشن بنائی ہی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے تھی۔

ناردرن لائٹ انفنٹری سے وابستگی

حوالدار لالک جان نے اپنے علاقے ہی کے سکول سے تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ ناردرن لائٹ انفنٹری میں بحیثیت سپاہی

بھرتی ہوگئے۔ اس وقت وہ ابھی نو عمر ہی تھے لہٰذا انہوں نے اس ملازمت کے دوران میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور میٹرک تک تعلیم مکمل کر لی۔

لالک جان کے بارے میں اکثر یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ ملک پر قربان ہونے اور لوگوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔

فوجی خدمات کے دوران میں انہوں نے کارگل سیکٹر میں اہم ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ یوں تو کارگل میں مجاہدین آزادی قریباً دس سال سے ہندوستان کی باقاعدہ فوج سے برسرپیکار تھے۔ پھر 1999ء میں تو کارگل کی دراس وادی میں صورت حال اس قدر نازک اور کشیدہ ہوگئی تھی کہ پاکستانی اور بھارتی افواج بھی براہ راست جنگ وجدل میں الجھ گئیں۔ یہاں پر پاکستانی افواج اور مجاہدین نے بھارت کے اسی نوے ہزار فوجیوں کو نرغے میں لے لیا تھا۔ اس نازک صورت حال میں بھارتی حکمرانوں نے اپنے سب سے بڑے اور پرانے سرپرست امریکہ کو مداخلت کے لیے پکارا تو اس وقت کے امریکی صدر کلنٹن نے بڑی عجلت میں 4 جولائی 1999ء کو ایک باہمی معاہدے کے تحت ہندوستانی فوجیوں کی آزادی اور تحفظ کو یقینی بنالیا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ جس دور میں کارگل میں جنگ اپنے عروج پر تھی، اس وقت حوالدار لالک جان چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ انہیں جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنی چھٹی کے ختم ہونے کا بھی انتظار نہ کیا، فوراً ہی اپنے والدین سے مشورہ کرکے معرکہ کارگل میں بنفس نفیس شریک ہونے کی شدید خواہش کا اظہار کیا۔ لہٰذا وہ فوراً ہی محاذ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

جذبۂ شہادت

بتایا جاتا ہے کہ وہ اس وقت بھی جذبۂ شہادت سے سرشار تھے۔ انہوں نے اپنے گھر سے محاذ جنگ کی طرف روانگی کے لیے اپنی والدہ ماجدہ سے کہا کہ "پیاری ماں، میرے لیے خلوص دل سے دعا کریں کہ میں پاکستان کا دفاع کرتے ہوئے شہادت کی سعادت حاصل کروں۔" ماں جی نے انہیں بچشم نم دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا، اور اللہ کے حوالے کیا۔ اس کے بعد ماں دیر تک اپنے بتیس سالہ بہادر، نڈر اور پرجوش

بیٹے کے بارے میں سوچتی اور دعائیں کرتی رہی۔

جلد ہی حوالدار لالک جان نے اپنی کمپنی میں حاضر ہوکر بالخصوص اگلے مورچوں پر جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ افسران بالا نے انہیں ایک آدھ بار یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگلے مورچے دشمن کے زیادہ حملوں اور شدید جنگی کارروائیوں کی زد میں آتے ہیں۔ لیکن سوار لالک جان کو اس حقیقت کا بخوبی علم تھا اور انہوں نے بار بار اصرار کیا کہ انہیں کسی بھی کٹھن اور دشوار مرحلے اور مقام پر بھیج دیا جائے۔

لہٰذا انہیں ایک انتہائی کٹھن، مشکل اور دشوار گزار پہاڑی چوکی پر دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے متعین کر دیا گیا۔ افسران کے اس فیصلے پر سوار لالک جان نے اظہار تشکر کے بعد دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے کمر باندھ لی۔

حق و باطل کے معرکے

ایک رات کا واقعہ ہے کہ بھارتی دشمن کی ایک بٹالین نے لالک جان کی چوکی پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ اس شدید حملے سے بھی ان کے حوصلے اور جوش و جذبے میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اس حملے کے دوران میں حوالدار لالک جان اپنی جان کی پروا کیے بغیر ہر طرف سے دشمن پر فائرنگ کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے قریبی مورچوں پر خود جا جا کر فوجی جوانوں کے حوصلے بڑھاتے رہے اور تحسین و تبریک سے کام لیتے رہے۔ دشمن کا یہ شدید اور متواتر حملہ رات بھر جاری رہا۔ لیکن حوالدار لالک جان ساری رات بڑی مستعدی، بہادری، چابک دستی اور ثابت قدمی سے جوابی وار کرتے رہے۔ صبح ہونے تک دشمن لاشوں کے انبار چھوڑ کر پسپا ہو چکا تھا۔ دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملایا جا چکا تھا۔

اس سے اگلی رات پھر معرکہ ہوا۔ اس معرکے کے لیے دشمن مزید کمک حاصل کر چکا تھا، اس لیے اب وہ چاروں جانب سے پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تیزی کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ ادھر اس چوکی پر لالک جان رات بھر کے جگراتے کے باوجود تازہ دم اور پرجوش تھا۔ اس رات بھی دشمن کو ناکوں چنے چبوائے۔ سوار لالک جان نہایت فوجی مہارت، بہتر معاملہ فہمی اور بروقت اور مناسب کارروائیاں کرکے دشمن کو بھاری نقصان پہنچاتا رہا تھا۔

قریباً ہر رات محاذ آرائی کا یہی چلن رہا۔ بھارتی فوجوں کو بدستور تازہ کمک پہنچتی رہی۔ 7 جولائی 1999ء کو دشمن نے حوالدار لالک جان کی پوسٹ پر اپنے توپ خانے سے تابڑ توڑ بھرپور حملہ کر دیا۔ خوب فائرنگ ہونے لگی۔ دن بھر گولوں کی بارش ہوتی رہی۔ لیکن گولوں کی اس بارش میں بھی حوالدار لالک جان بڑی جرأت مندی اور ہوشیاری کے ساتھ نہ صرف دشمن کا مقابلہ کرتے رہے بلکہ دشمن پر پے بہ پے وار بھی کرتے رہے۔

اسی رات دشمن نے ایک بار پھر حوالدار لالک جان کی چوکی پر تین اطراف سے بھرپور اور پرزور حملہ کیا۔ اس حملے میں باحوصلہ، شہادت کا طلب گار لالک جان شدید زخمی ہو گیا۔ اس وقت کمپنی کمانڈر نے دو ایک بار لالک جان کو مزید کارروائی کرنے سے روکنا بھی چاہا لیکن سوار لالک جان اپنی پوسٹ پر بڑی ذمے داری کے ساتھ ڈٹا رہا اور زخمی حالت میں بھی دشمن پر وار کرتا رہا اور اسے نقصان سے دوچار کرتا رہا۔ بہر صورت اس حملے کو بھی بہادر، نڈر، مستقل مزاج لالک جان نے ناکام بنا دیا تھا لیکن کاری زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنی پوسٹ پر ہی شہید ہو گیا۔

حوالدار لالک جان نے نہایت دلیری، جرأت مندی اور بہادری سے کارگل سیکٹر میں پاکستانی مورچے کا آخری وقت تک دفاع کیا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود بھی دشمن کے ناپاک قدم پاکستانی مورچے تک نہ پہنچنے دیئے۔

انہوں نے جس حوصلے، پامردی، استقامت کے اپنے مورچے کا دفاع کیا اور دشمن کے پے بہ پے حملوں کا دندان شکن جواب دیا اس کی مثال کم کم نظر آتی ہے۔ وہ زخمی حالت میں تکلیف اور درد کی کیفیت کے ساتھ بھی دشمنوں کو نیست نابود کرتے رہے اور آخری دم تک سرزمین پاک کا دفاع کرتے ہوئے سرخرو ہوئے۔ اور یوں انہوں نے اپنی چوکی پر ہی شہادت پائی۔

حوالدار لالک جان شہید کی اسی بے باکی، جذبہ شہادت اور عظیم قربانی کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان نے انہیں نشانِ حیدر عطا کیا۔

حوالدار لالک جان شہید نشانِ حیدر حاصل کرنے والے دسویں مجاہد ہیں۔۔۔۔اور شمالی علاقہ جات سے نشانِ حیدر پانے والے پہلے فوجی جوان ہیں۔
